۱۹۶

ماہنامہ

میثاق

لاہور

زیرِ ادارت

امین احسن اصلاحی

قیمت فی پرچہ ساٹھ پیسے۔
سالانہ چھ روپے (پندرہ شلنگ)

Regd. No. L. 7360

ماہنامہ میثاق لاہور

جلد ۹ | جمادی الاول ۱۳۸۳ھ | شمارہ ۴

فہرست مضامین

○ تذکرہ و تبصرہ	امین احسن اصلاحی	۲
○ تدبر قرآن		
تفسیر سورۂ بقرۃ	〃	۹
○ افادات فراہی		
اجماع کی تین قسمیں	خالد مسعود صاحب ایم ایس سی	۲۸
○ مراسلہ و مذاکرہ		
بیعت کی شرعی حیثیت	امین احسن اصلاحی	۳۵
○ مقالات		
حفاظت قرآن	جناب خالد مسعود صاحب	۳۹
○ اقتباسات و تراجم		
اسلامی نظام تعلیم کا ارتقاء	ڈاکٹر امیر حسن صاحب صدیقی	۴۸
○ تقریظ و تنقید	م - ا - ع د	۵۳

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ

منیجر ماہنامہ "میثاق"

رحمانپورہ ـــــ اچھرہ لاہور ۱۲

ہندوستانی خریداروں کیلئے ترسیل زر کا پتہ

منیجر ہفت روزہ "ندائے ملت"

باغ گونگے نواب ـــــ لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ و تبصرہ

ستمبر کے میثاق میں تفسیر — تدبر قرآن — کی جو قسط چھپی ہے اس میں لفظ صوم کی لغوی تحقیق کی بحث معلوم نہیں کس غلط فہمی کے نتیجے میں ناتمام رہ گئی اور لطف یہ ہے کہ میں اس مفروضہ پر کہ پوری بحث لکھی جا چکی ہے آخری بحث میں جو روزے کے اثرات سے متعلق ہے اس کا حوالہ بھی دے بیٹھا۔ پرچہ شایع ہونے کے بعد ایک رفیق عزیز نے اس فروگزاشت کی طرف توجہ دلائی تو سخت افسوس ہوا۔ ممکن ہے دوسرے قارئین نے بھی اس خلا کو محسوس کیا ہو اور اس کے سبب سے الجھن میں پڑے ہوں۔ براہ کرم فصل ۲۲ کی چھٹی سطر کے بعد مندرجہ ذیل عبارت کا اضافہ کر لیجئے۔ یہ استاذ امام مولانا فراہیؒ کے افادات میں سے ہے اور تکمیل بحث کے لئے نہایت ضروری ہے۔

مولانا لفظ صوم کی تحقیق کے سلسلہ میں اپنی کتاب اصول الشرائع میں فرماتے ہیں۔

"اہل عرب اپنے گھوڑوں اور اونٹوں کو بھوک اور پیاس کا عادی بنانے کے لئے باقاعدہ ان کی تربیت کرتے تھے تاکہ مشکل اوقات میں وہ زیادہ سے زیادہ سختی برداشت کر سکیں۔ اسی طرح وہ اپنے گھوڑوں کو تند ہوا کے مقابلے کی بھی تربیت دیتے تھے۔ یہ چیز گھوڑ جنگ کے حالات میں، جب کہ ہوا کے تھپیڑوں سے سابقہ پیش آجائے، بڑی کام آنے والی ہے .... جریر نے اپنے ایک شعر میں ان دونوں باتوں کا حوالہ دیا ہے۔ وہ کہتا ہے ؎

ظللنا بمستن الحرور کاننا   لدی فرس مستقبل الریح صائم

(ہم لُو کے تھپیڑوں کی جگہ جمے رہے گویا ہم ایک ایسے گھوڑے کے ساتھ کھڑے ہوں جو باد تند کا مقابلہ کر رہا ہو اور روزہ رکھے ہوئے ہو۔)

اس شعر میں اس نے اپنے اور اپنے ساتھیوں کے حال کی تشبیہ ایک ایسے شخص سے دی ہے جو اپنے گھوڑے کے ساتھ کھڑا ہو اور اس کو بھوک اور باد تند کے مقابلے کی تربیت دے رہا ہو۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ اہل عرب تشبیہ کے لئے انہی چیزوں کو استعمال کرتے ہیں جو ان کے عام تجربے میں آئی ہوں۔ ان کو نادر چیزوں کی تلاش زیادہ نہیں ہوتی .... الغرض گھوڑوں کے صوم کے بارے میں اشعار بہت ہیں۔"

(۲)

حدیث کی مشہور کتاب مُسند حمیدی کے جزو اول کی طباعت و اشاعت کی بشارت ہم گزشتہ اشاعت میں دے چکے ہیں۔ اس مہینے میں ہمیں اس کا دوسرا حصہ بھی موصول ہو گیا ہے اور اسی پر یہ کتاب تمام ہوتی ہے۔ پوری کتاب کے صفحات ۵۴۸ ہیں۔ فہرست مضامین اور انڈکس وغیرہ کے صفحات اس سے الگ ہیں۔ طباعت ٹائپ کی ہے اور نہایت روشن ہے۔ کاغذ بھی عمدہ لگایا گیا ہے۔ مرتب کتاب مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے اطلاع دی ہے کہ ہر جلد کی قیمت ۹ روپے ہے۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو اجر جزیل سے نوازے جو کسی پہلو سے بھی اس خدمت عظیم میں شریک ہوئے ہیں اور مسلمانوں کو توفیق دے کہ وہ اس کی قدر کریں۔ سرمایہ دار حضرات بہت سی چیزیں شوقیہ خریدتے ہیں، اگر وہ اس طرح کی چیزیں بھی اپنی الماریوں میں رکھنے کا تھوڑا سا شوق پیدا کر لیں تو ان کے مال سے بالواسطہ علم اور دین کی بھی کچھ خدمت انجام پا جائے۔ سنتے ہیں کہ جب مسلمانوں میں علم کی قدر دانی کا دور تھا تو امراء و اغنیاء محض تفاخر کے طور پر بھی اپنے ہاں کتبخانے رکھتے تھے۔ افسوس ہے کہ ہماری قوم کے دینی جذبات کے ساتھ اس کے اس طرح کے دنیوی جذبات بھی سرد پڑ گئے۔

کتاب کے پاکستانی قدر دان مجلس علمی کراچی سے اس کے لئے فرمائش کر سکتے ہیں۔

(۳)

اسلامی مشاورتی کونسل کی طرف سے ستمبر میں جو سوال نامہ جاری ہوا تھا اس کی کاپیاں ہمیں ابھی موصول ہوئی تھیں۔ ہم اس کا جواب لکھنے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ کونسل ہی کے ایک مراسلہ کے ذریعہ سے یہ

اطلاع دی گئی کہ "بعض قوانین میں ترمیم کی تجویز کی بنا پر نظرِ ثانی کے لئے وقتی طور پر یہ سوال نامہ واپس لے لیا گیا ہے۔"

اگرچہ سوال ناموں کے بارے میں ہماری رائے کبھی اچھی نہیں رہی ہے، ہم اس چیز کو دفع الوقتی کا ایک کارگر حربہ سمجھتے ہیں جو اس زمانے میں بالعموم محض عوام کی تسکین بخشی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن اس سوال نامے سے دو پہلوؤں سے ہمیں بڑی خوشی ہوئی تھی۔ ایک تو اس پہلو سے کہ اس سے ایک ایسے دستوری ادارے کی زندگی کا ایک ثبوت فراہم ہوا تھا جس پر قومی خزانے کا لاکھوں روپیہ خرچ ہو رہا ہے اور جس کی کارکردگی ہی پر اب اس ملک میں اسلامی قانون اور اسلامی تہذیب و ثقافت کی نشاۃِ ثانیہ کا انحصار ہے۔ دوسرے اس پہلو سے کہ اس کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوا تھا کہ اس کو مرتب کرنے والے فساد کے ان گوشوں سے بے خبر نہیں ہو سکتے جہاں سے ساری خرابیاں ہماری قوم میں پھیل رہی ہیں اور جو اس کے دین و ایمان اور اخلاق و تہذیب ہر چیز کو برباد کر رہی ہیں۔

لیکن اس سوال نامہ کو پا کر جتنی خوشی ہوئی تھی اب اس کی واپسی کی اطلاع سے اس سے زیادہ صدمہ ہوا ہے۔ واپس لینے کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ "بعض قوانین میں ترمیم کی تجویز کی بنا پر" یہ واپس لیا گیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ "بعض قوانین" کے الفاظ سے مراد "بعض سوالات" ہوں گے۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ سوال نامہ ارکانِ کونسل سے مشورے کے بغیر بالا بالا ہی کسی نے شائع کر دیا تھا یا ان سے مشورے کے بعد شائع کیا گیا تھا؟ اگر پہلی صورت ہے تو اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کونسل کے اندر نظم و ضبط کا کیا حال ہے۔ اور اگر دوسری صورت ہے تو جو ترمیمات ہمارے ان ارکان کے اذہان و قلوب پر اب وارد ہوئی ہیں، تھوڑا سا اپنے دماغوں پر زور ڈال کر انہوں نے ان کو پہلے ہی سوچنے کی سعی کیوں نہیں فرمائی۔ ایک کام کر گزرنے کے بعد اس پر سوچنے کی یہ ادا آخر ان حضرات نے کہاں سے سیکھی ہے؟

اور اگر واقعہ یہ ہے، جیسا کہ بعض لوگ گمان کرتے ہیں، کہ اس کی واپسی میں اصلی دخل مرکزی حکومت کو ہے تو یہ بات قوم اور ارکانِ کونسل دونوں کے حوصلوں پر ایک ضرب کاری ہے۔ اگر اس غریب کونسل کی یہ حیثیت بھی نہیں ہے کہ یہ اپنی آزاد رائے سے ایک سوال نامہ تک شائع کر سکے تو آخر اسکے قائم کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ جمہوریت اور اسلامیت کے دعوے کے ساتھ ساتھ اول تو استبداد کا کوئی جوڑ ہے نہیں اور اگر ہمارے اربابِ کار ان دونوں کا جوڑ ملائے رکھنا ضروری سمجھتے ہیں تو اس کی کوئی خوبصورت شکل ایجاد کریں، یہ شکل تو بڑی بھونڈی ہے۔

خود کونسل کو بھی اس معاملے میں اپنا پوزیشن صاف کرنا چاہیئے۔ مراسلے میں سوال نامے کی واپسی کی جو وجہ بتائی گئی ہے وہ تو نہایت ہی مضحکہ خیز ہے کسی طرح بھی طبیعت اس کو قبول کرنے پر راضی نہیں ہوتی۔

(۴)

اس بات سے ہمیں بڑی خوشی ہوئی ہے کہ بہاولپور میں جامعہ عباسیہ کو محکمہ اوقاف کے زیرِ اہتمام ایک اسلامی یونیورسٹی کی حیثیت دی جا رہی ہے اور محترم صدرِ ریاست کے ہاتھوں باضابطہ اس کا افتتاح ہو چکا ہے۔ محکمہ اوقاف کے زیرِ اہتمام اگر واقعی اسلام اور مسلمانوں کے لئے کچھ مفید کام ہونے لگیں تو حکومت کا اوقاف پر قبضہ کرنا کچھ گراں نہ گزرے لیکن اب تک تو اس محکمہ کے ہاتھوں جو کام انجام پائے ہیں وہ کچھ زیادہ امید افزا نہیں ہیں۔ مزاروں پر قوالی، چراغاں اور چادریں چڑھانے کے کام تو ہمارے عوام بھی خاصی حد تک انجام دے لیتے تھے، اگر یہی کام ذرا زیادہ وسیع پیمانے پر سرکاری اہتمام میں ہونے لگے تو اس سے اس کے سوا کیا فرق پیدا ہوا کہ جو بے عقلیاں اور نادانیاں اب تک عوام کالانعام کے ہاتھوں ہو رہی تھیں ان کی ذمہ داری خود ہماری سرکارِ دولت مدار نے اٹھا لی۔ اگر یہ سب کچھ محض عوامی جذبات کی پاسداری میں ہو رہا ہے تو عوامی جذبات کی پاسداری کے نقطۂ نظر سے تو شاید زیادہ بہتر شکل یہی ہوتی کہ حکومت اوقاف کی ذمہ داریوں سے دامن کشاں ہی رہتی لیکن جب اس نے عوام کے جذبات سے صرفِ نظر کر کے اوقاف پر قبضہ کر ہی لیا تو اسے چاہیئے کہ وہ ان کو اسلام اور مسلمانوں کی بہبود کا ذریعہ بنائے۔

جامعہ عباسیہ کو ایک اسلامی یونیورسٹی کے درجے تک ترقی دینا ہمارے نزدیک ایک نہایت مفید کام ہے اور ہم اس پر محکمہ اوقاف کو مبارکباد دیتے ہیں لیکن ایک دو باتیں اس سلسلے میں بھی قابلِ گزارش ہیں۔ امید ہے ہمارے اربابِ حل و عقد ان پر بھی غور فرمائیں گے۔

ایک تو یہ ہے کہ اس یونیورسٹی کا منصوبہ پیش کرنے والوں نے اس کی افادیت واضح کرتے ہوئے جس بات پر سب سے زیادہ زور دیا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے سند یافتہ ان مساجد و مدارس کی امامت و نظامت

سنبھال سکیں گے جو اب حکومت کے زیر اہتمام ہیں۔ ہم یہ عرض کرتے ہیں کیا اسلام کا علم رکھنے والوں کی ضرورت صرف ہماری مسجدوں ہی کو ہے، ہماری حکومت اور اس کے مختلف شعبوں اور محکموں کو نہیں ہے؟ کیا ایک ایسی حکومت میں جس کے متعلق ہمارے ارباب حل و عقد شروع سے یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ یہ اسلام کے لئے قائم کی گئی ہے، ایک تھانیدار اور تحصیل دار سے لے کر اونچے سے اونچے عہدہ دار اور ذمہ دار تک خواہ وہ ڈائرکٹر ہو، یا سکریٹری، جج ہو یا وکیل، سفیر ہو یا وزیر، ممبر ہو یا اسپیکر، پروفیسر ہو یا چانسلر، گورنر ہو یا صدر یکساں ضروری نہیں ہے کہ وہ علم دنیا کے ساتھ ساتھ علم دین کے بھی جاننے والے ہوں۔ اگر یہ ضروری ہے (اور ہمارا خیال ہے کہ اس کے ضروری ہونے سے کوئی معقول آدمی انکار کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا)، تو آخر ساری فکر مسجدوں ہی تک کیوں محدود ہے، حکومت چلانے کے لئے اس یونیورسٹی سے آدمی تیار کرنے کی کوشش کیوں نہ کی جائے۔ پاکستان کے بنیادی نصب العین کو پیش نظر رکھتے ہوئے تو اس وقت ہمارے ملک کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ایک ایسی یونیورسٹی قائم ہو جو میکالے کے نظریات کے بجائے اسلامی نظریہ تعلیم کو فروغ دے اور اس راہ میں ملک کی دوسری یونیورسٹیوں کی رہنمائی کرے تاکہ ان سے ایک صحیح قسم کی اسلامی حکومت چلانے کے لئے اشخاص پیدا ہو سکیں۔ اگر "اسلام" "اسلام" کا شور محض عوام فریبی کے لئے نہیں ہے اور اسلام کو صرف مسجدوں ہی کے اندر بند رکھنا نہیں ہے تو کم از کم اس ملک میں ایک یونیورسٹی تو ایسی ہو جو رہنمائی دے کہ اسلامی نقطہ نظر سے ہمارے موجودہ تعلیمی نظام میں کیا تبدیلیاں ضروری ہیں۔ آخر یہ ضروری کام کرنے کا وقت کب آئے گا؟

دوسری گزارش یہ ہے کہ اس یونیورسٹی کو اگر کسی درجے میں بھی اسلام اور مسلمانوں کے لئے مفید بنانا ہے تو نہ مستشرق ٹائپ کے لوگوں کو اس پر مسلط کرنا صحیح ہو گا، نہ جامد اور متعصب قسم کے لوگوں کو۔ ان دونوں ہی قسم کے اشخاص سے اسلام کے مقصد کو فائدہ کے بجائے الٹا نقصان پہنچے گا۔ اس کے لئے ایسے اشخاص تلاش کرنے کی ضرورت ہے جو عقیدۃً اور عملاً مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ ذہناً محقق اور اسکالر ہوں۔ ہمارے صدر ریاست نے اس یونیورسٹی کے افتتاح کے موقع پر جو تقریر ارشاد فرمائی ہے اس میں انہوں نے علماء کے

جمود اور تقلید پر جو کچھ ارشاد فرمایا ہے ہم اس کی پوری پوری تائید کرتے ہیں لیکن یہ عامیانہ تقلید کی بیماری کچھ مولویوں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ جو حضرات ولایت سے ڈگریاں لے کر آتے ہیں یہ مولویوں سے کہیں زیادہ عامیانہ تقلید کے مارے ہوئے ہوتے ہیں۔ علماء اپنی نصابی کتابوں کے دائرے سے باہر نہیں نکلتے اور یہ حضرات مستشرقین کے اقوال و ارشادات سے کچھ الگ ہو کر نہیں سوچ سکتے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ علماء کے جمود پر ماتم کرنے والے تو بہت ہیں، یہاں تک کہ ہمارے صدر ریاست کو بھی ان کے حال زار پر توجہ کے لئے فرصت مل جاتی ہے لیکن ہمارے ان پاکستانی "مستشرقین مقلدین" کے حال زار پر کوئی ماتم نہیں کرتا حالانکہ ان کا حال علماء کے حال سے کچھ کم قابل ماتم نہیں۔

(۵)

حلقہ تدبر قرآن کا کام بحمداللہ پابندی کے ساتھ جاری ہے۔ حلقہ کے رفقاء اور معاونین میں آہستہ آہستہ اضافہ ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کام میں برکت ڈالے اور ہماری نئی نسل کو اس سے فائدہ اٹھانے کی توفیق دے۔

ہمارے پیش نظر "دین سیکھو اور سکھاؤ" کا نصب العین ہے اور ہم اپنے وسائل کی وسعت کے ساتھ اس کام کو پورے ملک میں وسیع کرنا چاہتے ہیں۔ کم از کم اپنے ملک کے ہر بڑے شہر میں ایک مرکز تو ضرور ایسا قائم کر دینا چاہتے ہیں جو نئی تعلیم یافتہ نسل کی دینی تعلیم و تربیت کا ذریعہ بن سکے۔ اس وجہ سے اس حلقہ میں مطلوب صرف انہی لوگوں کی شرکت ہے جو "دین سیکھو اور سکھاؤ" کے نصب العین کو اپنا لینے کے لئے تیار رہیں اور آج بھی اس کے لئے جد و جہد کر سکیں اور آئندہ بھی اس کے لئے کام کرنے کا عزم و جزم رکھتے ہوں۔

دین سیکھنے کے معاملہ میں بھی ہمارے پیش نظر صرف بطور تبرک کچھ دین کی باتیں جان لینا نہیں ہے جس سے صرف رسمی دین داری کا کچھ تحفظ ہو سکے بلکہ دین میں وہ تفقہ پیدا کرنا ہے جو موجودہ زمانے کے فکری تصادم میں نوجوانوں کو اسلام کی حقیقی نصرت و حمایت کے قابل بنا سکے۔ اس وجہ سے وہی لوگ اس حلقہ کے لئے کارآمد ہو سکتے ہیں جو آج دین سیکھنے کے لئے پوری محنت کر سکتے ہوں اور کل اس کو سکھانے اور اس پر چلنے اور چلانے کے ایثار اور جہاد کر سکتے ہوں۔ جن کے پیش نظر صرف

عربی کی حرف شناسی یا کوئی امتحان پاس کر لینا ہو دین میں تفقہ کا داعیہ جن کے اندر نہ ہو ان کے لئے اس حلقے میں شرکت کچھ زیادہ سود مند نہ ہوگی۔

ہم اپنے رفقاء و معاونین سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے ماحول میں اپنے امکان کے حد تک اس مقصد کا تعارف کرائیں گے۔ اور اس کے لئے سعید روحوں کی تلاش کریں گے۔ ماحول کے انتہائی فساد کے باوجود آج بھی ان کے اندر ایسی روحیں موجود ہیں جو مردہ نہیں ہوئی ہیں، لیکن ان کی جستجو کی اور ان کے اندر شوق کی حرکت پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ کام بجائے خود ایک بہت بڑا دینی کام ہے۔ اگر آج ان کو تربیت و اصلاح کی طرف متوجہ کر دیا گیا تو آئندہ ان سے اصلاح کی بڑی بڑی امیدیں کی جاسکتی ہیں ورنہ کون کہہ سکتا ہے کہ کل ان کی صلاحیتیں کس باطل کی خدمت میں برباد ہوں۔

کیا

○ اِسلام آج کی دُنیا میں بحیثیت نظام رائج ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

○ کیا اِسلامی قانون کی تدوین ممکن ہے؟ اور مسلمان جو متعدد اور باہم متصادم فرقوں اور گروہوں میں منقسم ہو چکے ہیں کیا اِسلامی قوانین کے ایک ہی مجموعے پر متحد و متفق ہو سکتے ہیں؟

ان سوالات کے جواب آپ کو اسلامی قانون کے ماہر اور قرآنی علوم کے غواص عالم دین جناب

مولانا امین احسن اصلاحی کی تازہ ترین تالیف "اِسلامی قانون کی تدوین"

میں ملیں گے۔ قیمت اعلیٰ ایڈیشن ۳ روپے۔ سستا ایڈیشن ۲ روپے۔ علاوہ محصول ڈاک۔

ملنے کا پتہ:۔ مکتبۃ المنبر پوسٹ بکس ۱۰۱ لائلپور

تدبر قرآن

امین احسن اصلاحی

تفسیر سُورۂ بقرہ

(۳۳)

۶۶۔ آگے کا مضمون آیت (۱۸۸)

اُوپر ہم یہ اشارہ کر گئے ہیں کہ روزے کے حکم سے پہلے بھی اور اس کے بعد بھی عزیزوں اور رشتہ داروں کے حقوق اور دوسروں کے اموال و املاک غصب کرنے کی ممانعت فرمائی ہے۔ اس سے شریعت کے نظام میں روزے کا مقام واضح ہوتا ہے کہ اس عبادت کا اصل مقصود حرص و طمع، بخل اور لالچ اور اس قبیل کی دوسری بیماریوں پر قابو پانا ہے۔ ان پر قابو پانے ہی سے انسان کے اندر وہ تقویٰ پیدا ہوتا ہے جو حقوق و معاملات میں اس کو عدل پسند اور محتاط بناتا ہے۔ گویا جن چیزوں سے بچتے رہنے کی ہدایت کی ان سے نفس کو بچانے میں جو تدبیر سب سے زیادہ کارگر ہو سکتی ہے اس کی طرف بھی رہنمائی فرما دی۔

مزید غور کیجئے تو یہ حقیقت بھی واضح ہوگی کہ روزے کے بیان سے پہلے تو حق داروں کے لئے وصیت کی، اس وصیت میں عدل و انصاف اور پھر اس وصیت کے، ایمان داری کے ساتھ، اجراء و نفاذ کی ہدایت کی۔ اور روزے کے بیان کے بعد رشوت کے ذریعہ سے حکام کو خریدنے اور اس چیز کو دوسروں کے حقوق کے غصب کا ذریعہ بنانے کی ممانعت فرمائی اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح ایمان باللہ کی ساری قدر و قیمت اسی وقت تک ہے جب تک وہ شرک کی ملاوٹ سے پاک ہے، جہاں اس میں شرک ملا زندگی کے لئے اس کی ساری افادیت ختم ہوئی اسی طرح قانون کی ساری افادیت اس وقت تک ہے جب تک قانون کے نفاذ کے لئے دیانت دار حکام موجود ہیں اور معاشرہ رشوت کی بیماری سے پاک ہے، جہاں رشوت معاشرے

میں رواج پائی بس قانون کی افادیت کا جنازہ نکلا۔ اس وضاحت کی روشنی میں غور کیجیے تو نظر آئے گا کہ گویا ایک ہی حکم کے دو پہلو یہاں مذکور ہوئے۔ ایک کا ذکر روزے سے پہلے کیا، دوسرے کا بعد میں اور روزے کا ذکر دونوں کے بیچ میں رکھ دیا تاکہ نظم کلام ہی سے یہ بات واضح ہو جائے کہ جو شخص اپنے آپ کو ان مطامع اور ان خواہشات پر غالب کرنا چاہتا ہے وہ اپنے نفس کی تربیت روزے سے کر کے یہ چڑھائی چڑھ سکتا ہے۔

اس روشنی میں اب آگے کی آیت تلاوت فرمائیے۔ ارشاد ہے۔

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۱۷۸)

اور تم آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقہ سے نہ کھاؤ اور اس کو حکام رسی کا ذریعہ نہ بناؤ کہ اس طرح دوسروں کے مال کا کچھ حصہ حق تلفی کر کے ہڑپ کر سکو۔ درآنحالیکہ تم اس حق تلفی کو جانتے ہو۔

۶۷۔ الفاظ کی شرح اور جملوں کی وضاحت

"وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ"۔ اکل اموال سے مراد مجرد کھانا نہیں بلکہ اس کا ناجائز استعمال و تصرف ہے۔ باطل، حق کا ضد ہے۔ جس طرح حق کا لفظ، جیسا کہ ہم واضح کر چکے ہیں مختلف معنوں میں آتا ہے اسی طرح اس کا ضد بھی مختلف معنوں میں آتا ہے۔ باطل ایک تو عبث اور بے مقصد کے معنی میں آتا ہے۔ مثلاً "رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا" (۱۹۱- آل عمران) (پروردگار تو نے یہ کارخانہ بے مقصد نہیں بنایا ہے) اس کے دوسرے معنی کسی ایسی چیز کے ہیں جس کی عقل یا فطرت یا شریعت کے اندر کوئی بنیاد نہ ہو۔ مثلاً وَجَادَلُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ ۵۔ غافر (اور انہوں نے باطل کے ذریعہ سے مخالفت کی تاکہ اس سے حق کو پسپا کریں) اسی طرح باطل اس طریقہ کو کہتے ہیں جو عدل، انصاف، شریعت، معروف اور سچائی کے خلاف ہو۔ اس کے تحت جھوٹ، خیانت، غصب، رشوت، سود، سٹہ، جوا، چوری اور معاملات کی وہ ساری قسمیں آتی ہیں جن کو شریعت نے ناجائز قرار دیا ہے۔ یہاں بات اجمال کے ساتھ کہی گئی ہے، دوسرے مقامات میں اس کی تفصیل آگئی ہے اور پھر مزید تفصیل احادیث میں ہے۔ اسلام میں تمام معاملات کی بنیاد اسی اصول پر ہے۔

"وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ"۔ "ادلاء" کے اصل معنی کنوئیں میں ڈول ڈالنے کے ہیں۔ مثلاً فرمایا ہے فَاَدْلٰى دَلْوَهٗ (یوسف) یہیں سے اس کے اندر رسائی اور قربت حاصل کرنے کا مفہوم پیدا ہو گیا۔ جس طرح رسّی کے ذریعہ سے ڈول پانی تک پہنچتا ہے اسی طرح مال رشوت خور حکام تک رسائی کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ فرمایا کہ دوسروں کا مال ہڑپ کرنے کے لئے مال کو حکام رسی کا ذریعہ نہ بناؤ۔ اس لئے کہ رشوت حصولِ مال کا جائز ذریعہ نہیں ہے بلکہ یہ اثم یعنی گناہ، حق تلفی اور غصب حقوق کا راستہ ہے۔ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ یعنی اس کا گناہ اور حق تلفی ہونا تمہیں معلوم ہے۔ تمام دنیا کے معروف اور ہر دین و شریعت میں اس کا گناہ ہونا مسلم رہا ہے۔ عقل کے نزدیک بھی اس کا گناہ ہونا ایک امر بدیہی ہے۔

اس جملہ کا عطف پہلے جملہ پر ہے اور چونکہ یہ پہلے جملے ہی کی وضاحت کر رہا ہے اس وجہ سے اس میں حرف "لا" کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہوئی۔ اسی سورہ کی آیت ۴۲ کے تحت ہم اس اسلوب کی بقدر ضرورت تشریح کر چکے ہیں۔

یہ آیت رشوت پر مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالتی ہے۔

ایک تو یہ کہ یہ ناجائز طریقہ سے دوسروں کے حقوق ہڑپ کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ چنانچہ یہاں دوسروں کا مال ناجائز طریقہ سے کھانے کی ممانعت کے بعد خاص طور پر اسی چیز کا ذکر کیا۔ اس کی وجہ صاف ہے کہ قانون، جو لوگوں کے حقوق کی حفاظت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، اس کی افادیت کا تمام تر انحصار، جیسا کہ ہم نے فصل کے شروع میں اشارہ کیا، حکام کی راست روی اور دیانت پر ہے۔ وہی قانون کے اصلی محافظ ہیں۔ اس وجہ سے اگر ان کو کسی ذریعہ سے بددیانت بنا دیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اب حقوق بکاؤ مال ہیں جس کے پاس پیسے ہوں وہ ان کو خرید سکتا ہے۔ رشوت حکام کو بددیانت بنانے کا ظاہر ہے کہ سب سے زیادہ کارگر حربہ ہے۔

دوسرا یہ کہ رشوت کی گرم بازاری میں سب سے زیادہ مؤثر عامل خود معاشرہ ہے۔ جب لوگوں میں دوسروں کے حقوق ہڑپ کرنے کا رجحان پیدا ہوتا ہے تو وہ اپنی غرض پوری کرنے کے لئے رشوت کی راہ اختیار کرتے ہیں اور اس طرح حکام کے منہ کو خون لگا دیتے ہیں۔ پھر جب ان کے منہ رشوت کا خون لگ جاتا ہے تو وہ اس کے ایسے رسیا ہو جاتے ہیں کہ وہ رشوت لئے بغیر لوگوں کو خود ان کے واجبی

حقوق بھی نہیں دیتے۔ اس وجہ سے اسلام نے سب سے پہلے خود معاشرے کو یہ راہ اختیار کرنے سے روکا ہے کہ اپنے ہی پہرہ داروں کو خود اپنی ہی بدآموزی سے چور نہ بناؤ۔ اور اس معاملہ میں اتنی احتیاط برتی ہے کہ حکام کو تحفے اور ہدیے پیش کرنے اور ان کے لئے ان کے قبول کرنے کو بھی جیسا کہ احادیث سے واضح ہے، ناپسند کیا اس لئے کہ یہ بھی رشوت کا ایک چور دروازہ ہے۔

تیسرا یہ کہ رشوت کا گناہ ہونا ایک ایسی واضح حقیقت ہے کہ اس کو سب جانتے ہیں۔ عقل اس کی گواہ ہے، فطرت انسانی اس کی شاہد ہے، دنیا کا معروف اس پر حجت ہے اور تمام مذاہب و ادیان اس کی حرمت پر متفق ہیں۔ چنانچہ فرمایا کہ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (اور تم اس بات کو جانتے ہو)

۶۸- آگے کا مضمون آیات (۱۸۹-۲۰۳)

اُوپر روزے کے بیان کے ساتھ جس پہلو سے ضمناً لوگوں کے مال ہڑپ کرنے اور اس کے لئے رشوت کو ذریعہ بنانے کی ممانعت کا ذکر آیا ہے، اس کی وضاحت ہم کر چکے ہیں۔ اب آگے حج اور جہاد کا بیان آ رہا ہے جن کی مناسبت روزے کیساتھ تشریح کی محتاج نہیں۔ حج کے بیان کے سلسلہ میں سب سے پہلے ان محترم مہینوں کے احکام و آداب سے متعلق لوگوں کے سوال کو نقل کیا ہے جو حج و عمرہ کے لئے مخصوص اور اشہر حرم کے نام سے معروف ہیں۔ یہ سوال لوگوں کے ذہنوں میں اس وجہ سے پیدا ہُوا ہو گا کہ جب اللہ تعالٰے نے بیت اللہ کو اُمّتِ مسلمہ کا قبلہ قرار دیا ہے اور کفار کے قبضہ سے اس کو آزاد کرنا ضروری قرار دیا ہے، جیسا کہ قبلہ کی بحث میں (آیات ۱۴۲-۱۶۲) گذر چکا ہے تو اس سے لازم آتا ہے کہ حج کے لئے جہاد کے مرحلہ سے گزرنا پڑے گا۔ پھر اس جہاد کے تعلق سے کئی سوالات پیدا ہوئے۔ مثلاً یہ کہ اس جہاد کی نوبت محترم مہینوں میں آئے تو اس کا حکم کیا ہے؟ یہ سوال اس وجہ سے پیدا ہُوا کہ ان محترم مہینوں میں جنگ ہمیشہ سے ممنوع رہی ہے۔ زمانہ جاہلیت میں بھی عرب ان کا پورا احترام کرتے رہے ہیں اور اسلام نے بھی ان کے احترام کا حکم دیا ہے۔ اسی طرح یہ سوال بھی پیدا ہوا کہ اگر اس جنگ کی نوبت عین حرم اور حدود حرم میں پیش آئے تو اس کا حکم کیا ہو گا؟ یہ سوال اس وجہ سے پیدا ہُوا کہ حرم میں جنگ تو درکنار اس میں کسی جانور کو چھیڑنے کی بھی زمانہ قدیم سے ممانعت تھی۔ اسی طرح جہاد کے تعلق سے انفاق کا سوال بھی سامنے آیا اس لئے کہ جہاد ممکن نہیں جب تک کہ لوگ جان کے ساتھ ساتھ اپنے مال بھی پوری فیاضی سے راہ خدا میں خرچ کرنے پر آمادہ نہ ہوں۔ ظاہر ہے

کہ یہ انفاق اس انفاق سے زاید ہے جس کا ذکر اُوپر گزر چکا ہے۔ اس طرح گویا حج کے مسئلہ نے اپنے اندر حج کے مسائل و احکام کے ساتھ ساتھ گوناگون سوالات وقت کے مخصوص حالات کی بنا پر جہاد، اشہر حرم اور انفاق وغیرہ سے متعلق بھی جمع کر لئے۔ ایک ظاہر بین جب ان مختلف قسم کے مسائل کو ایک دوسرے کے ساتھ اُلجھا ہُوا دیکھتا ہے تو اس کو کلام میں بے ربطی معلوم ہوتی ہے لیکن اگر کوئی شخص اس زمانہ کو پیش نظر رکھ کر اس پُورے سلسلہ پر غور کرے جس زمانہ میں یہ احکام اُترے ہیں تو اس کو یہ حقیقت صاف نظر آئے گی کہ یہ ساری باتیں ایک ہی سلسلہ کی مربوط کڑیاں ہیں۔ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِىَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ؕ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ
تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ص
وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ وَقَاتِلُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَ
لَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ
مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ
الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ؕ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ۝
فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ
الدِّيْنُ لِلّٰهِ ؕ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۝ اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ
الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى
عَلَيْكُمْ ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۝ وَاَنْفِقُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
ع وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۛ وَاَحْسِنُوْا ۛ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۱۹۵ وَ
اَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ؕ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْىِ ۚ وَلَا تَحْلِقُوْا
رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْىُ مَحِلَّهٗ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ
رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ ٚ فَمَنْ تَمَتَّعَ
بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْىِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ
فِى الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ؕ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ

حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝
الْحَجُّ أَشْهُرٌ مَّعْلُومَاتٌ ۚ فَمَن فَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ
فِي الْحَجِّ ۗ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ يَعْلَمْهُ اللَّهُ ۗ وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوَىٰ ۚ
وَاتَّقُونِ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ ۝ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَن تَبْتَغُوا فَضْلًا مِّن رَّبِّكُمْ ۚ فَإِذَا
أَفَضْتُم مِّنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوا اللَّهَ عِندَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۖ وَاذْكُرُوهُ كَمَا هَدَاكُمْ
وَإِن كُنتُم مِّن قَبْلِهِ لَمِنَ الضَّالِّينَ ۝ ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ وَ
اسْتَغْفِرُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ فَإِذَا قَضَيْتُم مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا
اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا ۗ فَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي
الدُّنْيَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۝ وَمِنْهُم مَّن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا
حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ أُولَٰئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّمَّا
كَسَبُوا ۚ وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ ۝ وَاذْكُرُوا اللَّهَ فِي أَيَّامٍ مَّعْدُودَاتٍ ۚ فَمَن تَعَجَّلَ
فِي يَوْمَيْنِ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ وَمَن تَأَخَّرَ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ لِمَنِ اتَّقَىٰ ۗ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَ
اعْلَمُوا أَنَّكُمْ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ۝

النصف

وہ تم سے اشہر حرم کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ کہہ دو یہ لوگوں کے فوائد اور حج کے اوقات ہیں۔ اور تقوٰی یہ نہیں ہے کہ تم گھروں میں ان کے پچھواڑوں سے داخل ہو، بلکہ تقوٰی ان کا تقوٰی ہے جو حدود الٰہی کا احترام ملحوظ رکھیں۔ گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہو اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم فلاح پاؤ۔ ۱۸۹۔

اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کریں اور حد سے بڑھنے والے نہ بنو۔ بے شک اللہ حد سے بڑھنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ ۱۹۰۔ اور ان کو جہاں کہیں تم پاؤ قتل کرو اور ان کو وہاں سے نکالو جہاں سے انہوں نے تم کو نکالا ہے، اور فتنہ قتل سے بھی بڑھکر ہے۔ اور تم ان سے مسجد حرام کے پاس خود پہل کر کے جنگ نہ کرو جب تک وہ تم سے اس میں جنگ نہ چھیڑیں۔ پس اگر وہ تم سے جنگ چھیڑیں تو ان کو قتل کرو، یہی کافروں کا بدلہ ہے۔ ۱۹۱۔ پس اگر وہ باز آجائیں تو اللہ بخشنے والا اور مہربان

ہے۔ ۱۹۲۔ اور ان سے جنگ کرو، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہ جائے اور دین اللہ کا ہو جائے۔ اور اگر یہ باز آجائیں تو پھر اقدام صرف ان کے خلاف جائز ہے جو ظالم ہیں۔ ۱۹۳۔

شہر حرام، شہر حرام کا بدلہ ہے اور اسی طرح دوسری محترم چیزوں کا بھی قصاص ہے۔ تو جو تم پر زیادتی کریں تو تم بھی ان کی زیادتی کے جواب میں اسی کے برابر ان کو جواب دو اور اللہ سے ڈرتے رہو اور یہ یقین رکھو کہ اللہ حدود الٰہی کا احترام کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ ۱۹۴۔

اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ اور اپنے آپ کو تباہی میں نہ جھونکو۔ اور انفاق خوبی کے ساتھ کرو۔ بے شک اللہ خوبی کے ساتھ کام کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ ۱۹۵۔

اور حج و عمرہ کو اللہ کے لئے پورا کرو۔ پس اگر تم گھر جاؤ تو جو ہدی میسر ہو وہ پیش کردو اور اپنے سر نہ مونڈو جب تک ہدی اپنی جگہ نہ پہنچ جائے۔ جو تم میں سے بیمار ہو یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو تو اس کے لئے روزے یا صدقہ یا قربانی کی شکل میں فدیہ ہے۔ جب اطمینان کی حالت ہو تو جو کوئی حج تک عمرہ سے فائدہ اٹھائے تو وہ قربانی پیش کرے جو میسر آئے۔ جس کو میسر نہ آئے تو وہ تین دن کے روزے دوران حج میں رکھے اور سات دن کے روزے واپسی کے بعد۔ یہ کل دس دن ہوئے۔ یہ ان کے لئے ہے جن کا گھر در جوار حرم میں نہ ہو۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو اور اچھی طرح جان رکھو کہ اللہ سخت پاداش والا ہے۔ ۱۹۶۔

حج کے متعین مہینے ہیں تو جو کوئی ان میں حج کا عزم کرلے تو پھر اس کے لئے حج تک نہ شہوت کی کوئی بات کرنی ہے، نہ فسق و فجور کی، نہ لڑائی جھگڑے کی۔ اور نیکی کے جو کام بھی کرو گے اللہ اس کو جانتا ہے اور اس کے لئے تقوٰی کا زاد راہ لو، بہترین زاد راہ تقوٰی کا زاد راہ ہے اور مجھ سے ڈرتے رہو، اے عقل والو۔ ۱۹۷۔

اس امر میں کوئی گناہ نہیں ہے کہ تم اپنے رب کے فضل کے طالب بنو۔ پس جب عرفات سے چلو تو خدا کو یاد کرو مشعر حرام میں ٹھہر کر اور اس کو اس طرح یاد کرو جس طرح

خدا نے تم کو ہدایت کی ہے۔ اس سے پہلے بلاشبہ تم گمراہوں میں تھے۔ ۱۹۸۔

پھر تم بھی وہیں سے چلو جہاں سے لوگ چلیں اور اللہ سے گناہوں کی معافی مانگو، بیشک اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ ۱۹۹۔

پھر جب تم حج کے مناسک ادا کر چکو تو اللہ کو یاد کرو جس طرح تم پہلے اپنے باپ دادا کو یاد کرتے رہے ہو بلکہ اس سے بھی بڑھ چڑھ کر۔ لوگوں میں سے کچھ ایسے ہیں جن کی دُعا یہ ہوتی ہے کہ اے ہمارے رب ہمیں دُنیا میں کامیابی عطا کر، حالانکہ آخرت میں اُن کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ ۲۰۰۔ اور کچھ ایسے ہیں جن کی دُعا یہ ہوتی ہے کہ اے ہمارے رب ہمیں دُنیا میں بھی کامیابی عطا فرما اور آخرت میں بھی اور دوزخ کے عذاب سے بچا۔ ۲۰۱۔ یہی لوگ ہیں جن کو ان کے کئے کا حصہ ملنا ہے۔ اور اللہ جلد حساب چکانے والا ہے۔ ۲۰۲۔

اور گنتی کے چند دنوں میں اللہ کو یاد کرو۔ سو جو دو ہی دنوں میں اُٹھ کھڑا ہو اس پر کوئی گناہ نہیں اور جو ٹھہرا رہے اس پر بھی کوئی گناہ نہیں۔ یہ رعایت ان کے لئے ہے جو تقویٰ کو ملحوظ رکھیں۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو اور خوب جان رکھو کہ تم اسی کے حضور میں اکٹھے کئے جاؤ گے۔ ۲۰۳۔

۶۹۔ الفاظ کی تشریح اور جملوں کی وضاحت

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ... لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝

اَہِلّہ ہلال کی جمع ہے۔ ہلال شروع ماہ کے چاند کو بھی کہتے ہیں اور اس سے مراد مہینہ بھی ہوتا ہے۔ خاص طور پر جمع کی صورت میں تو اس کا استعمال کچھ مخصوص مہینوں سے متعلق ہے اور سیاق و سباق پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سوال اَشہرِ حُرم اور ان کے احکام و آداب سے متعلق تھا چنانچہ آگے کی آیات میں اس سوال کے جو جواب دیئے ہیں وہ تمام ترحج اور اشہر حرم ہی سے متعلق ہیں۔ قرآن مجید میں جیسا کہ ہم اُوپر اشارہ کر چکے ہیں، سائلوں کے سوالات چونکہ اجمال و اختصار کے ساتھ نقل ہوئے ہیں اس وجہ سے عام اہل تاویل کو یہ گمان ہوا کہ یہ سوال چاند کے گھٹنے بڑھنے سے متعلق تھا۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اس کے صحیح نہ ہونے کے مختلف وجوہ ہیں جن میں سے بعض کا ہم ذکر کریں گے۔

اول یہ کہ اس قسم کا سائنسی اور فلکیاتی سوال عربوں کے مذاق اور ان کی عام افتاد مزاج کے خلاف

ہے۔ اہل عرب سورج اور چاند کو خدا کی مخلوق اور اس کے قانون طبعی کے تحت ان کو مسخر
تھے، پھر اس نامعقول سوال کی کیا گنجائش تھی کہ چاند گھٹتا بڑھتا کیوں ہے؟ وُہ خود سمجھ سکتے
پیغمبرؐ کو کوئی زچ کرنے والا سوال نہیں بن سکتا، وہ بڑی آسانی سے اس کا جواب دے سکتے
خدا کے حکم سے گھٹتا بڑھتا اور یہ اس کے مسخر و محکوم ہونے کی ایک بہت بڑی دلیل ہے
اس سے پہلے مختلف اسلوبوں اور شکلوں میں مکی سورتوں میں دیا بھی جا چکا تھا بلکہ وہ
کے سامنے موجود تھیں جو چاند کے طلوع و غروب سے حضرت ابراہیمؑ نے توحید کے حق میں
پھر اس قسم کے کسی سوال کا کیا موقع تھا؟

دوسری یہ کہ یہاں سیاق و سباق دلیل ہے کہ سوال عام عربوں یا اہل کتاب کی طرف
ہے بلکہ مسلمانوں کی طرف سے ہے۔ مسلمانوں کی طرف سے چاند یا سورج کے گھٹنے بڑھنے
ایک بالکل ہی بعید از قیاس سوال ہے۔ وہ سوال کر سکتے تھے تو مہینوں کے احکام و آدا
کر سکتے تھے نہ کہ ایک بالکل ہی غیر ضروری اور لایعنی سوال۔

تیسری یہ کہ اگر سوال چاند کے گھٹنے بڑھنے سے متعلق ہوتا تو یوں نقل ہوتا کہ يَسْئَلُ
الْہِلَالِ (وہ تم سے چاند کے بابت سوال کرتے ہیں) يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَہِلَّةِ کے الفاظ نہ
کے معروف معنی تو جیسا کہ ہم اُوپر اشارہ کر چکے ہیں، یہ ہوں گے کہ وہ تم سے مخصوص مہینو
سوال کرتے ہیں۔

چوتھی یہ کہ قرآن نے یہ سوال نقل کر کے اس کے جوابات دیئے ہیں وہ تمام تر جیسا کہ
سے واضح ہوگا، حج اور اشہر حُرم کے احکام و آداب ہی سے متعلق ہیں، اُن میں کوئی ادنیٰ
کے گھٹنے بڑھنے کی علت کی طرف نہیں ہے۔ اگر یہ فرض کیا جائے کہ قرآن نے اُن کے
در خور اعتنا نہیں سمجھا اس وجہ سے اس سے بالکل صرفِ نظر کر کے ان کو مہینوں سے متعلق
بتا دیں تو کم از کم یہاں کوئی اشارہ اس بات کی طرف ضرور ہوتا تھا کہ لوگوں کو غیر ضروری سو
کرنے چاہئیں جیسا کہ دوسرے بعض مقامات پر اس قسم کی تنبیہ لوگوں کو کی گئی ہے۔

بہرحال ہمارے نزدیک اس سوال کا کوئی تعلق بھی چاند اور اس کے اُتار چڑھاؤ
بلکہ، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، ان محترم مہینوں سے اس کا تعلق ہے جو حضرت ابراہیمؑ کے

قرآن نے اس بدعت کی تردید کی اور فرمایا کہ گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہو، اس سے تقویٰ میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا البتہ آخرت کی فلاح اور خدا کی خوشنودی مطلوب ہے تو اس کے حدود کی پاسداری ملحوظ رکھو اور اس سے برابر ڈرتے رہو۔ حج سے اصل مقصود یہی تقویٰ ہے۔

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا ...... الْمُعْتَدِينَ ۝ یہ مسلمانوں کو اس بات کی اجازت ہے کہ اگر حج کے سلسلہ میں جنگ کی نوبت آجائے تو اشہر حرم میں دفاعی جنگ جائز ہے۔ البتہ حدود سے تجاوز اللہ کو پسند نہیں ہے۔ یعنی نہ تو یہ بات جائز ہے کہ تم خود اشہر حرم میں جنگ کے لئے پہل کرو اور نہ یہ جائز ہے کہ مدافعت کے لئے جتنی کارروائی ضروری ہے، اس سے آگے کوئی قدم اٹھاؤ البتہ مدافعت کرنے کے تم پورے طور پر مجاز ہو، اشہر حرم یا خود حرم کا احترام اس میں کسی پہلو سے مانع نہیں ہے بلکہ یہ عین ان کے احترام کا تقاضا ہے۔ اس نکتہ کی تفصیل آگے کی آیات میں آرہی ہے۔

حج کے ذکر کے ساتھ یہ وضاحت اس لئے ضروری ہوئی کہ اس وقت تک حرم پر مشرکین کا قبضہ تھا اس وجہ سے اس بات کا اندیشہ نہایت قوی تھا کہ اگر مسلمان حج کے لئے جائیں گے تو کفار روکیں گے اور جنگ کی نوبت آجائے گی۔ بالخصوص جبکہ مشرکین پر اس دوران میں یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو چکی تھی کہ مسلمانوں نے بیت اللہ کو اپنا قبلہ قرار دے لیا ہے اور ان کا دعویٰ یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے بنائے ہوئے اس گھر کی تولیت کے اصلی وارث وہی ہیں۔ ایسی حالت میں یہ ضروری ہوا کہ مسلمانوں کو حرم اور اشہر حرم کے احکام و آداب سے متعلق وہ ضروری ہدایات دے دی جائیں جو آگے کے امکانی حالات میں ان کی رہنمائی کر سکیں۔ یہ حقیقت یہاں پیش نظر رہے کہ حرم اور اشہر حرم کے احترام کے باب میں پوری قوم عرب کے احساسات نہایت نازک تھے۔ ان میں لڑنا بھڑنا سب ہی کے نزدیک سب سے بڑی معصیت تھی اس وجہ سے مسلمان بھی اس وقت تک ان میں کسی جنگ کے لئے اگرچہ وہ مدافعت ہی میں کیوں نہ ہو تیار نہیں ہو سکتے تھے جب تک قرآن اس کی اجازت نہ دے۔

وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأَخْرِجُوهُم مِّنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ ...... كَذَٰلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ ۝ یعنی بیت اللہ کا حج تم پر فرض ہے اور ملت ابراہیمؑ کے اصلی وارث ہونے کی حیثیت سے یہ تمہارا حق بھی ہے بلکہ اس کے اصلی حقدار تم ہی ہو اس وجہ سے اگر تمہارے اس حق

فرض کی راہ میں قریش مزاحم ہوں تو ان کا مقابلہ کرو اور جہاں کہیں ان سے تصادم ہو رہیں ان کو قتل کرو اگرچہ اس قتال کی نوبت حرم اور حدود حرم ہی میں پیش آجائے۔ اور جس مکہ سے انہوں نے تم کو نکالا ہے تم بھی ان کو وہاں سے نکالو، اس لئے کہ ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السّلام کی وراثت صرف نسل و نسب کی بنا پر کسی کو حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ خود حضرت ابراہیمؑ کے ارشاد کے بموجب اس کے اصلی حقدار وہ ہیں جو ان کی ملت پر قائم ہیں۔ یہ درجہ تم کو حاصل ہے نہ کہ ان کو۔ اس وجہ سے اس گھر سے نکالے جانے کے مستحق وہ ہیں نہ کہ تم۔

وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ (اور فتنہ قتل سے بھی بڑا جرم ہے) فتنہ کے معنی یہاں کسی کو جبر و ظلم سے اس کے مذہب سے برگشتہ کرنے کی کوشش کے ہیں۔ انگریزی میں اس کو (PERSECUTION) کہتے ہیں۔ قرآن میں یہ لفظ اس معنی میں جگہ جگہ استعمال ہوا ہے۔ مثلاً إِنَّ الَّذِينَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوبُوا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ ۱۰۔ بروج (بے شک جن لوگوں نے ایمان لانے والوں اور ایمان لانے والیوں کو دین سے پھیرنے کے لئے اذیتیں پہنچائیں ان کے لئے جہنم کا عذاب ہے) عَلَىٰ خَوْفٍ مِّن فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِمْ أَن يَفْتِنَهُمْ ۸۳۔ یونس (فرعون اور اس کے درباریوں سے ڈرتے ہوئے کہ مبادا وہ اس کو مصیبت میں مبتلا کر دیں) ثُمَّ إِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِينَ هَاجَرُوا مِن بَعْدِ مَا فُتِنُوا ۱۱۰۔ نحل (پھر تیرا رب ان لوگوں کے لئے جنہوں نے ہجرت کی بعد اس کے کہ وہ طرح طرح کی ایذاؤں میں مبتلا کئے گئے)

اور مشرکین قریش سے قتال کی جو اجازت دی گئی ہے، یہاں تک کہ اگر حدود حرم اور اشہر حرم میں بھی وہ جنگ کریں تو ان کو قتل کرنا اور مکہ سے ان کو بے دخل کرنا جائز ٹھہرایا گیا ہے، یہ اس کی دلیل ارشاد ہوئی ہے۔ اس چھوٹے سے فقرے کا مطلب یہ ہے کہ ہر چند حدود حرم اور اشہر حرم میں قتل و قتال بڑی سنگین بات ہے لیکن جس گھر میں اللہ کے بندوں اور بندیوں کو اس بنا پر ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جا رہا ہے کہ وہ اللہ پر ایمان کیوں لائے، یہ ظلم و ستم اس قتل سے بھی زیادہ سنگین ہے۔ اس سنگین تر فتنہ کو مٹانے کے لئے تمہیں یہ اجازت دی جاتی ہے کہ اگر نوبت جنگ پیش آجائے تو تم کفار کو ترکی بہ ترکی جواب دو اور جہاں کہیں وہ تمہارے مقابل میں آئیں ان کو قتل کرو۔ یہ چیز نہ احترام حرم کے منافی ہے نہ حرمت اشہر حرم کے۔

"وَلَا تُقَاتِلُوهُمْ عِندَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتَّىٰ يُقَاتِلُوكُمْ فِيهِ" یہ تاکید ہے اس بات کی کہ مسلمان مسجد حرام کے

پاس جنگ میں پہل نہ کریں۔ ہاں اگر ان کو مسجد حرام سے روکنے کے لئے ان پر کفار کی طرف سے حملہ کیا جائے تو اس کا منہ توڑ جواب دیں۔ مسجد حرام کا احترام ایک مشترک ذمہ داری ہے اگر کفار مسلمانوں کی دشمنی میں اس کے احترام کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں تو پھر وہ خود بھی اس کے احترام کے نام پر کسی رعایت کے مستحق نہیں رہتے ہیں۔ یہ درحقیقت ان کے اپنے کئے کی سزا ہے۔ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ۔ یعنی ایسے کافروں کا ایسا ہی بدلہ ہے۔

فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ "پس اگر وہ باز آجائیں تو اللہ غفور رحیم ہے۔" "باز آجائیں" سے مراد صرف جنگ سے رُک جانا نہیں ہے۔ یہاں اس "باز آجانے" کا صلہ یہ بتایا ہے کہ "پھر اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔" ظاہر ہے کہ کفار اگر مسلمانوں سے جنگ نہ کریں تو اس کا زیادہ سے زیادہ صلہ یہ ہو سکتا ہے کہ مسلمان بھی ان کو مہلت دیں اور بالفعل ان سے جنگ نہ کریں، یہ صلہ تو اس کا نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ ان کے تمام کفر و فسق معاف کر دے۔ اس وجہ سے یہاں باز آجانے سے مقصود اس عناد و مخالفت، اور اس جبر و ظلم (PERSECUTION) سے باز آجانا ہے جس کے قریش مرتکب ہوئے تھے اور جس کے ذریعہ سے انہوں نے مسلمانوں کو ان کے گھروں سے نکال دیا تھا اور ساتھ ہی بیت اللہ سے مسلمانوں کو روکنے سے باز آجانا ہے جس کے وہ کسی پہلو سے بھی حق دار باقی نہیں رہ گئے تھے۔

اس سورہ میں قبلہ کی بحث سے لے کر یہاں تک کے مباحث پر اگر آپ کی نظر ہے تو حقیقت آپ سے مخفی نہیں ہو سکتی کہ یہ ساری بحث عام کفار سے متعلق نہیں ہے۔ بلکہ اس کا تعلق خاص کفار قریش سے ہے۔ ان کی اور مسلمانوں کی نزاع کسی جزوی معاملہ کے لئے محض ایک وقتی نزاع نہیں تھی بلکہ اصلاً یہ نزاع بیت اللہ کی تولیت کے لئے تھی۔ قرآن کا دعویٰ یہ تھا کہ حضرت ابراہیمؑ کے بنائے ہوئے اس گھر کی تولیت کے اصلی حقدار اہل ایمان ہیں نہ کہ کفار و مشرکین جنہوں نے اس گھر کو اس کے بنیادی مقاصد کے بالکل خلاف شرک و کفر کا ایک گڑھ بنا کے رکھ دیا ہے۔ قرآن کا یہ بھی دعویٰ تھا کہ حضرت ابراہیمؑ کی دعا اور وعدہ الٰہی کے بموجب جس آخری نبیؐ کے ذریعہ سے اس گھر کے مقاصد کی تجدید و تکمیل ہونی تھی، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور قدسی نے اسی وعدے کی تکمیل کر دی اور اب یہ لازمی ہے کہ یہ گھر کفار و مشرکین کے تسلط سے آزاد اور کفر و شرک کی نجاستوں سے پاک ہو

کر ملت ابراہیمؑ — اسلام — کا مرکز اور تمام اہل ایمان کا قبلہ بنے — یہ دعویٰ جن دلائل و براہین اور جس زور و قوت کے ساتھ اس پوری سورت میں پیش ہوا ہے اس میں کہیں کسی لچک اور کسی نرمی کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ بلکہ واضح الفاظ میں بات یوں کہی جا سکتی ہے کہ بیت اللہ کو کفار کے قبضہ سے چھڑانا اور اس کو شرک و کفر کی تمام آلائشوں سے پاک کر کے از سر نو اس کو توحید، اسلام اور ملت مسلمہ کا مرکز بنانا رسالت محمدیؐ کا اصلی نصب العین تھا اور اس نصب العین کا حصول ہی گویا آنحضرت صلعم کے مقدس مشن کا آخری کام تھا۔ اس روشنی میں غور کیجیے تو یہ حقیقت بالکل واضح ہو کر سامنے آجائے گی کہ "فَاِنِ انْتَهَوْا" کے معنی صرف یہ نہیں ہے کہ کفار قریش جنگ سے رُک جائیں بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اپنی ان تمام مخالفانہ و معاندانہ حرکتوں سے جن کے وہ آج اس دعوت حق کی مزاحمت کے لئے مرتکب ہو رہے ہیں، باز آکر اس کے حامی و معاون بن جائیں۔ اگر وہ یہ راہ اختیار کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے وہ تمام جرائم معاف کر دے گا جن کے وہ اب تک مرتکب ہوئے ہیں۔ بعینہٖ یہی بات کفار قریش کو مخاطب کر کے سورہ انفال میں یوں فرمائی گئی ہے۔

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ۚ وَاِنْ يَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ (۳۸-۳۹ - انفال)

ان کافروں کو بتا دو کہ اگر وہ باز آگئے تو جو جرم کچھ وہ پہلے کر چکے ہیں وہ معاف کر دیا جائے گا اور اگر انہوں نے پھر اسی طرح کی حرکتوں کا اعادہ کیا تو ہمارے اس طریقہ کو یاد رکھیں جو ہم نے پچھلی قوموں کے معاملے میں اختیار کیا۔ اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ (PERSECUTION) بالکل باقی نہ رہ جائے اور اس سرزمین پر سارا دین صرف اللہ کا ہو جائے پس اگر وہ باز رہے تو جو کچھ وہ کریں گے اللہ اس کو دیکھ رہا ہے۔

یہی حقیقت سورہ توبہ میں اس طرح واضح کی گئی ہے کہ بیت اللہ کی تولیت میں کفار قریش کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ یہ خاص مسلمانوں کا حق ہے۔

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ

مشرکین کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اللہ کی مسجدوں کے منتظم بنے رہیں جب کہ وہ خود اپنے کفر

أُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ
إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ
الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَأَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ
وَلَمْ يَخْشَ إِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰٓى أُولٰٓئِكَ أَنْ
يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ○

(۱۷-۱۸ - توبہ)

کے گواہ ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کے تمام اعمال اکارت ہیں اور یہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ کی مسجدوں کے منتظم تو وہی ہو سکتے ہیں جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لائیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور اللہ کے سوا کسی چیز سے نہ ڈریں۔ انہی لوگوں کے متعلق توقع ہے کہ وہ بامراد ہوں۔

یہی خاص پہلو ہے جس کے سبب سے عام کفار کے برخلاف کفار قریش کے لئے یہ حکم ہوا کہ جب تک یہ توبہ کرکے نماز نہ قائم کریں اور زکوٰۃ نہ دیں اس وقت تک ان کے لئے کوئی ڈھیل نہیں ہے۔

فَإِذَا انْسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا
الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ
وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ
فَإِنْ تَابُوْا وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا
الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ إِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ
رَّحِيْمٌ ○

(۵ - توبہ)

پس جب اشہر حرم گزر جائیں تو مشرکین کو قتل کرو جہاں کہیں ان کو پاؤ اور ان کو پکڑو اور ان کو گھیرو اور ان کے لئے ہر گھات میں بیٹھو۔ پس اگر وہ توبہ کرلیں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو ان کی راہ چھوڑ دو۔ بے شک اللہ غفور رحیم ہے۔

یہاں ہم ان اجمالی اشارات پر کفایت کرتے ہیں۔ سورہ توبہ میں ہم ان شاء اللہ کفار قریش کے اس خاص مسئلہ پر پوری تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے۔

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ...... إِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ○

اس آیت سے اوپر والی آیت کے مضمون کی مزید وضاحت ہوگئی کہ کفار قریش سے یہ جنگ اس وقت تک جاری رہنی ہے جب تک سرزمین حرم پر فتنہ کا کوئی اثر باقی ہے اور اللہ کے دین کے سوا کوئی اور دین یہاں قائم ہے۔ یہ گھر صرف اللہ واحد کی عبادت کے لئے تعمیر ہوا تھا اس لئے اللہ کے دین کے سوا کسی دوسرے دین کے لئے یہاں گنجائش نہیں ہے۔ اور اب یہ کام حضرت ابراہیمؑ کی دعا اور اللہ کے وعدے کے مطابق ہونا ہے، کفار اس کو پسند کریں یا ناپسند۔ اسی بات کو سورہ صف میں یوں فرمایا ہے۔

هُوَ الَّذِيْٓ أَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ
دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَ
لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ○

(۹۔ صف)

وہی خدا ہے جس نے اپنے رسول کو بھیجا اپنی ہدایت اور دین حق کے ساتھ تاکہ اس دین کو سارے دینوں پر غالب کرے، اگرچہ مشرکین اس چیز کو ناپسند کریں۔

"وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ" کا صحیح موقع و محل اور اس کا اصلی زور سمجھنے کے لئے یہاں بالاجمال اس سنت اللہ کو سمجھ لینا ضروری ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کے باب میں پسند فرمائی ہے۔ وہ سنت اللہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کی طرف اپنا رسول بھیجتا ہے تو وہ رسول اس قوم کے لئے خدا کی آخری اور کامل حجت ہوتا ہے جس کے بعد کسی مزید حجت و برہان کی اس قوم کے لئے ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ اس کے بعد بھی اگر وہ قوم ایمان نہیں لاتی بلکہ تکذیب رسول اور عداوت حق ہی پر اڑی رہ جاتی ہے تو وہ فنا کر دی جاتی ہے۔ عام اس سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے کسی عذاب کے ذریعہ سے فنا ہو یا حق کے اعوان و انصار اور رسول کے ساتھیوں کے ہاتھوں اور عام اس سے کہ یہ واقعہ رسول کی زندگی ہی میں ظہور میں آئے یا اس کی وفات کے بعد۔ لَأَغْلِبَنَّ أَنَا وَرُسُلِيْ اور جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا اور اس مضمون کی دوسری آیات میں اسی سنت اللہ کی طرف اشارہ ہے اور اس کے ظہور کے لئے قرآن میں ایک مخصوص ضابطہ بیان ہوا ہے جس کی تفصیل کے لئے موزوں مقامات ہماری اس کتاب میں آگے آئیں گے۔[1]

اسی سنت اللہ کی طرف یہ آیت اشارہ کر رہی ہے کہ اس آخری رسالت کے مقصد کی تکمیل اس بات پر ہونی ہے کہ سرزمین حرم پر دین حق کے سوا اور کوئی دین باقی نہیں رہنے پائے گا۔ چنانچہ اسی بنیاد پر قرآن نے کفار عرب کے سامنے، جن کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت براہ راست تھی اور جو بیت اللہ پر بالکل ناجائز طور پر قابض تھے، صرف دو ہی راہیں باقی رکھی تھیں یا تو اسلام قبول کریں یا تلوار۔ دوسرے کفار کی طرح ان کے لئے جزیہ کی گنجائش نہیں تھی چنانچہ جب اتمام حجت کا تقاضا پورا ہوگیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ پر فوج کشی کی اور بیت اللہ پر

[1] یہ ملحوظ رہے کہ میں نے یہاں جس سنت اللہ کی طرف اشارہ کیا ہے اس کا تعلق خاص طور پر رسولوں سے ہے، ان انبیاء سے نہیں ہے جو صرف نبی تھے رسول نہیں تھے۔ نبی اور رسول کے اس فرق پر بھی مفصل بحث اپنے مقام

قبضہ کر کے اس کو کفر و شرک کی تمام آلائشوں سے بالکل پاک کر دیا اور جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ کا اعلان فرما دیا۔

پھر حرم الٰہی کو مستقل طور پر کفر و شرک کے غلبہ سے پاک رکھنے کے لئے یہ بھی ضروری ہوا کہ اس پورے علاقہ کو غیر اسلامی قبضہ یا مداخلت سے بالکل محفوظ کر دیا جائے جس میں یہ حرم واقع ہے چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے جزیرہ عرب کے متعلق یہ ہدایت دے دی کہ لَا يَجْتَمِعُ فِيهِ دِينَانِ اس میں دین حق کے ساتھ کوئی اور دین جمع نہیں ہو سکتا۔ اور آخر وقت میں آپ نے یہود و نصاریٰ کو بھی اس سر زمین سے نکال دینے کی وصیت فرمائی جس کی تعمیل حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں کی۔ یہ تدبیر مرکز اسلام کے سیاسی تحفظ کے لئے ضروری تھی اور یہ مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ اس گھر کے تحفظ کے لئے ہمیشہ بیدار رہیں اور کسی بھی غیر اسلامی طاقت کے قدم اس سرزمین پر جمنے نہ دیں۔

"فَإِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى الظَّالِمِينَ" "انتہوا" کا مفہوم ہمارے نزدیک وہی ہے جس کی طرف ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں۔ عدوان کے اصلی معنی تو تعدی اور زیادتی کے ہیں لیکن یہاں یہ لفظ مجرد اقدام (ACTION) کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ عربی زبان میں کبھی کبھی بعض الفاظ محض مجانست و ہم آہنگی کے لئے استعمال ہو جاتے ہیں۔ ان کا مفہوم موقع و محل سے متعین ہوتا ہے مثلاً کہتے ہیں دَنَاهُمْ كَمَا دَانُوا (ہم نے ان کو بدلہ دیا جیسا کہ انہوں نے ہمارے ساتھ کیا) ظاہر ہے کہ یہاں "دانوا" محض "دنا" سے مشابہت کی وجہ سے لایا گیا ہے ورنہ موقع فعلوا یا اس کے ہم معنی کسی لفظ کا ہے۔ یا قرآن میں ہے جَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِثْلُهَا (برائی کا بدلہ اسی کے مانند بدلہ ہے) ہر شخص جانتا ہے کہ کسی برائی کا بدلہ کوئی برائی نہیں ہے لیکن محض سابق لفظ کی ہم آہنگی کی وجہ سے جرم کے ساتھ اس کی سزا کو بھی سیئہ سے تعبیر دیا۔ اسی طرح آگے والی آیت میں ہے فَمَنِ اعْتَدَى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ (جو تم پر زیادتی کرے تو تم بھی اس کی زیادتی کے برابر اس کے خلاف اقدام کرو) اس آیت میں کسی کی زیادتی کے جواب میں جو اقدام کیا جائے اس کو بھی "اعتداء" کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے، حالانکہ یہ معنی میں محض اقدام کے ہے صرف اپنے اسبق کے ساتھ ہم آہنگی کی وجہ سے اس شکل میں استعمال ہوا۔ عربی زبان کے اسی معروف اسلوب کے مطابق زیر بحث آیت میں بھی لفظ "عدوان" استعمال ہوا لیکن مراد اس سے مجرد وہ اقدام ہے جو جوابی کارروائی کے طور پر کیا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ اپنی حرکتوں سے باز آ کر اسلام کی راہ

اختیار کر لیں تو ان کے پچھلے جرائم کی بنا پر ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوگی پھر صرف انہی کے خلاف کوئی اقدام ہوگا جو اپنے کفر و شرک اور اپنے ظلم و عدوان پر جمے رہ جائیں۔

اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ .... اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۞ اوپر بیان کئے ہوئے احکام کی یہ دلیل ارشاد ہوئی۔ مطلب یہ ہے کہ اشہر حرم میں یا حدود حرم میں لڑائی چھڑانی ہے تو بہت بڑا گناہ لیکن جب کفار تمہارے لئے ان کی حرمت کا لحاظ نہیں کرتے تو تمہیں بھی یہ حق حاصل ہے کہ قصاص کے طور پر تم بھی ان کو ان کی حرمت سے محروم کر دو۔ ہر شخص کی جان شریعت میں محترم ہے لیکن جب ایک شخص دوسرے کی جان کا احترام نہیں کرتا اس کو قتل کر دیتا ہے تو اس کے قصاص میں وہ بھی حرمت جان کے حق سے محروم کر کے قتل کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح اشہر حرم اور حدود حرم کا احترام مسلّم ہے بشرطیکہ کفار بھی ان کا احترام ملحوظ رکھیں اور ان میں دوسروں کو ظلم و ستم کا ہدف نہ بنائیں لیکن جب ان کی تلواریں ان مہینوں میں اور اس بلد امین میں بے نیام ہوتی ہیں تو وہ سزاوار ہیں کہ ان کے قصاص میں وہ بھی ان کے امن و احترام کے حقوق سے محروم کئے جائیں۔ مزید فرمایا کہ جس طرح اشہر حرم کا یہ قصاص ضروری ہے اسی طرح دوسری حرمتوں کا قصاص بھی ہے۔ یعنی جس محترم چیز کے حقوق حرمت سے وہ تمہیں محروم کریں تم بھی اس کے قصاص میں اس کے حق حرمت سے انہیں محروم کرنے کا حق رکھتے ہو۔ پس جس طرح کے اقدامات حرم اور اشہر حرم کی حرمتوں کو برباد کر کے وہ تمہارے خلاف کریں، تم ان کے جواب ترکی بہ ترکی دو۔ البتہ تقویٰ کے حدود کا لحاظ رہے۔ کسی حد کے توڑنے میں تمہاری طرف سے پیشقدمی نہ ہو اور نہ کوئی اقدام حد ضروری سے زائد ہو۔ اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت انہی لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو ہر طرح کے حالات میں اس سے ڈرتے رہتے ہیں۔

اعلان:۔ ماہنامہ "میثاق" کا نومبر ۱۹۶۳ء کا شمارہ انشاء اللہ نومبر کی دس بارہ تاریخ تک شائع ہوگا اور آئندہ انشاء اللہ باقاعدگی کے ساتھ ہر ماہ پرچہ بالکل ابتدائی تاریخوں میں قارئین کے ہاتھوں میں پہنچ جایا کرے گا۔

منیجر ماہنامہ میثاق لاہور

افادات فراہیؒ

جناب خالد مسعود صاحب

اجماع کی تین قسمیں

اجماع تین قسم کا ہوتا ہے ـــــ جزوی مسائل میں، اخبار و واقعات میں اور سیاسی امور میں۔ یہ اجماع علی الترتیب تین قسم کے لوگوں کے ذریعے سے ہوتا ہے ـــــ مجتہدین کے ذریعہ سے، مشاہدین کے ذریعہ سے اور اربابِ حل و عقد کے ہاتھوں۔

جزوی مسائل میں اجماع جزوی مسائل میں جو اجماع ہوتا ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ اگر کسی زمانہ کے مجتہدین کسی جزوی مسئلہ پر متفق ہو کر ایک رائے قائم کرلیں تو اس عہد میں موجود اُمت پر اس رائے کو اختیار کرنا اور اس کے مطابق عمل کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ البتہ اس کے بعد اگر دوسرے عہد کا کوئی مجتہد اس اجماع پر غور کرے اور پہلے مجتہدین کی غلطی اس پر ظاہر ہو جائے اور اس کے پاس پہلے اجتہاد کے خلاف ایک رائے قائم کرنے کے لئے ان مجتہدین کی نسبت زیادہ واضح دلائل ہوں تو اُمت پر سے پہلے اجماع کے اتباع کا وجوب ساقط ہو جاتا ہے لیکن جب اجماع کی نوعیت یہ ہو کہ مسلسل کئی زمانوں کے مجتہدین کسی مسئلہ پر متفق رہے ہوں تو اس اجماع سے اختلاف کی گنجائش کم رہ جاتی ہے اور کسی اختلاف کرنے والے کی اس وقت تک کوئی پروا نہیں کی جاتی جب تک وہ نہایت روشن دلائل اور واضح حق لے کر نہ آئے (اس لئے کہ اصل فیصلہ کن چیزیں بہرحال قرآن و سنت ہی ہیں) اور اس کی رائے پر کافی عرصہ غور ہونے کے بعد خدا مسلمانوں کے سینے اس کے لئے کھول نہ دے۔

اہل تقویٰ ہمیشہ جدید رائے کے بالمقابل سلفِ صالحین کی تقلید کی طرف زیادہ مائل رہے ہیں۔ لہٰذا مجتہد کو سلف سے اختلاف کرنے کی جرأت کرنے کے معاملہ میں خدا سے ڈرنا چاہیئے۔ لیکن اگر کوئی مجتہد یہ جرأت کرے اور ایسا کرنے کے لئے وہ اپنی تائید میں دلائل رکھتا ہو تو دوسرے لوگوں پر لازم ہے کہ وہ اس کی رائے کو سُنیں،

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں ارشاد فرمایا ہے۔

فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ

پس تو ان بندوں کو بشارت دے جو بات کو سنتے ہیں اور جو ان میں سے بہتر ہوتی ہے اس کی پیروی کرتے ہیں۔

سلف سے بھی یہی طرزِ عمل ثابت ہے۔ مثال کے طور پر وہ قرآن کو بین الدفتین جمع کرنے، اس کے متن پر اعراب و حرکات لگانے اور کعبہ کی تعمیر نو کے بارے میں نئی رائے کی نسبت سلف صالح کی تقلید ہی کی طرف زیادہ مائل تھے۔ مگر انہوں نے اس رائے کو سُنا اور جس معاملہ کو احسن پایا، اس کو اختیار کیا۔ نہ تو وہ ہر جدید چیز کی طرف بلا سوچے سمجھے لپکنے والے تھے اور نہ اگلوں کی تقلید ہی پر جامد تھے۔ ان کا طریقہ بالکل صحیح اور فطری تھا۔

اگر کسی شخص کا یہ خیال ہو کہ کسی سابق اجماع کے بالمقابل کسی نئے مجتہد کی رائے کی طرف ہمیں بالکل توجہ نہیں کرنی چاہیئے کیونکہ وہ اس رائے میں لازماً گمراہ ہوگا، اگر اس کو گمراہ نہ قرار دیا جائے تو اس سے یہ بات لازم آتی ہے کہ اُمتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک زمانہ تک کسی گمراہی پر جمع رہی ہے۔ تو ہمارا جواب یہ ہے کہ وہ جزوی مسائل جن کے بارے میں کوئی نص وارد نہیں ہے، اس طرح کی چیزیں نہیں ہیں جن کو گمراہی کے مواقع قرار دیا جائے اگر ان کو بھی یہی حیثیت دی جائے تو ہمیں ان بہت سے صحابہؓ اور تابعینؒ کو بھی نعوذ باللہ گمراہ ماننا پڑے گا جنہوں نے جزوی مسائل میں کسی الگ رائے پر عمل کیا۔

اخبار و واقعات پر اجماع جہاں تک اخبار و واقعات کا تعلق ہے ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ خدا بڑا رحیم و تواب ہے۔ وہ لوگوں کو کسی ایسی گمراہی میں نہیں پڑے رہنے دیتا جس سے ان کے لئے نکلنے کی کوئی راہ ہی نہ ہو۔ وہ حقیقت اور سچائی کے دروازے کبھی بند نہیں ہونے دیتا۔ چنانچہ جب دنیا میں گمراہی کی تاریکیاں چھا جاتی رہی ہیں اس نے اپنے رسول مبعوث فرمائے۔ اسی مقصد کے لئے اس نے زمین میں خلافت کا اور انسانوں میں نبوت کا منصب رکھا، افراد کو عقل اور سمجھ سے نوازا، کائنات کو سورج، چاند اور ستاروں سے منور کیا، شرائع کی تکمیل کرکے قرآن کی حفاظت کا ذمہ لیا اور سلسلۂ نبوت کو ختم کر دیا اور اپنی ذات مقدسہ کو ارض و سما کا نور قرار دیا۔ خدا حق کے نقوش کو مٹانے والا نہیں بلکہ ان کی نگہداشت فرمانے والا ہے۔ خدا کے متعلق حسن ظن تاریخ عالم اور قرآن میں غور و فکر کی مضبوط بنیاد فراہم کرتا ہے۔ خدا نے کتنی ہی بار باطل کو اور اس کے پرستاروں کو مٹایا اور

حق کے مددگاروں کو نجات دی بلکہ باطل کو زہوقا (مٹنے ہی والا) قرار دیا۔

خدا کے متعلق اس حسن ظن کی روشنی میں ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ خدا نے صحیح حالات و واقعات کو باطل پسندوں کی دستبرد سے ہمیشہ بچایا ہے۔ جب انہوں نے ان کو مسخ کرنے کا ارادہ کیا خدا نے ان کی آنکھیں بند کر دیں اور ان کے ہاتھ شل کر دیئے۔ انہوں نے کوئی سازش کی تو خدا نے اپنی تدبیر سے اس کو ناکام بنا دیا۔ پھر جب وہ حق سے بالکل ہی منحرف ہو گئے تو خدا نے بھی ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا۔ چنانچہ انہوں نے تحریف کی، حق کی اپنی بدعات کے مطابق تاویل کی اور ان کے دلوں نے یہ اعمال ان کو خوشنما کر کے دکھائے۔ لیکن جہاں تک حق کے نقوش کا تعلق ہے وہ ان تمام مخالفانہ سرگرمیوں کے باوجود بھی باقی رہے۔

مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ نے

۱: یہود اور نصاریٰ کی کتابوں میں نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کا نام، آپ کی علامات اور آپ کے حالات برقرار رکھے۔

۲: مشرکین کے درمیان "بیت اللہ" کو باقی رکھا اور اُمیوں میں حج اور دوسری عبادات کا وجود قائم رکھا۔

۳: ایام جاہلیت کی تاریخ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نشانیوں کی مسلسل حفاظت کی حالانکہ یہود نے عرب میں ان کی آمد اور بیت اللہ کی تعمیر کے واقعات کو چھپا دیا تھا،

۴: نصاریٰ نے اس مقدس گھر کے انہدام کی کوشش کی تو حملہ آوروں کو نیست و نابود کر دیا

۵: خود تورات میں بیت اللہ کا ذکر اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سرزمین عرب میں آمد کا واقعہ غور و فکر کرنے والوں کے لئے باقی رکھا اگرچہ یہود خاص طور پر ان باتوں کے آثار کو مٹانا چاہتے تھے، اور

۶: تمام اُمتوں کے اندر، ان کے مذاہب و اوطان کے اختلافات کے باوجود ایسی نشانیاں باقی رکھیں جو خدا کی تدبیر بنی آدم میں اس کے عدل اور اپنے نیک بندوں کے لئے اس کی نصرت کو واضح کرنے والی ہیں۔

ماضی کی خبروں کے بارے میں اس قدر وضاحت کرنے کے بعد ہم یہ کہیں گے کہ مختلف قسموں کے جو واقعات ہم تک پہنچے ہیں ان کو یک قلم ترک نہیں کر دینا چاہیئے بلکہ ان میں سے حق کو الگ کرنا چاہیئے۔ اور اس کے لئے جرح و تعدیل اور توفیق و تاویل کے اصول درایت کو استعمال میں لانا چاہیئے۔

جہاں تک ان خبروں کا تعلق ہے جو کسی اُمت کے ساتھ مخصوص ہیں ان کی تنقیح کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا جائے کہ حقیقت حال پر اجماع معلوم کرنے کے لئے ان باتوں کو بنیاد بنایا جائے جن پر اس امت کے مختلف طبقات متفق ہوں۔

رہیں وہ خبریں جو کسی خاص گروہ سے متعلق ہوں ان میں اجماع معلوم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم راویوں کی کثرت اور ان کے تقویٰ کی بنیاد پر ایک کے بالمقابل دوسرے کے راویوں کو رد کریں۔ مثال کے طور پر شیعوں کا اجماع ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کے لئے خلافت کی وصیت فرمائی۔ اس کے برعکس اہل سنت کا اجماع اس پر ہے کہ حضورؐ نے اپنے بعد کسی کی خلافت کی تصریح نہیں فرمائی البتہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کی طرف اشارہ فرمایا۔

ایسی صورت حال میں کسی ایک فرقے کا اجماع دوسرے فرقے پر حجت نہیں ہوگا بلکہ اس معاملہ میں غور و فکر کر کے حقیقت تک پہنچنا ایک ایسے ناقد محقق کا کام ہے جو قرآن و سنت کی روشنی میں تمام آرا کا مطالعہ کرے اور طرفین میں سے کسی کے لئے اس کے اندر تعصب نہ پایا جاتا ہو۔ اس کا نصب العین صرف حق کی تلاش ہو وہ اللہ کی طرف متوجہ رہے اور اسی کی رضا اور ہدایت کا طالب ہو۔ اگر اس طرح کے غور و فکر کے بعد حق اس پر واضح ہو جائے تو اس کو چاہیئے کہ بلا خوف لومۃ لائم وہ اس کو اختیار کرے۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسے محقق کے لئے ہم نے دین و تقویٰ کو کیوں ضروری قرار دیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ لوگ دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن کی نظروں میں دین اور خدا خوفی کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی اور جو ہر معمولی سے معمولی چیز پر قناعت کر لیتے ہیں۔ دوسرے وہ جن پر دین اور تقویٰ کا غلبہ ہوتا ہے۔ یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ مذہبی معاملات میں صحیح نقطہ نظر کا متلاشی محقق پہلی قسم کے لوگوں میں سے ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے کیونکہ اس طرح کے لوگوں کی تمام تر دلچسپی اپنی دُنیا بنانے میں ہوتی ہے۔ رہے دوسری قسم کے لوگ تو ان کی اکثریت درویشوں پر مبنی ہوتی ہے جو صرف اپنے اعمال و عبادات سے سروکار رکھتے ہیں۔ غور و فکر کی طرف ان کا زیادہ رجحان نہیں ہوتا۔ ان میں سے کچھ لوگ ایسے بھی نکل آتے ہیں جو اپنے دینی مشاغل کے ساتھ غور و فکر کو بھی جمع کر لیتے ہیں۔ یہی علماء جمہور کے قائد ہوتے ہیں۔

علماء کے اس قلیل گروہ کے تمام افراد اس قابل نہیں ہوتے کہ وہ مختلف فیہ مسائل میں غیر جانبداری

سے تحقیق کر سکیں۔ اس گروہ کی اکثریت تو زیادہ تر مخالفین کے ساتھ بحث و مناظرہ میں مشغول رہتی ہے۔ کوئی شخص معمولی سے معمولی معاملہ میں بھی ان کی رائے کی مخالفت کر دے تو ان کو دینی حمیت اکھڑتی ہے اور پھر ان کے لئے یہ مشکل ہوتا ہے کہ تعصب کے جس دود ھ پر وہ پلے ہیں اس کے اثر کو دل سے نکال دیں۔ ان لوگوں کا علم و مطالعہ جس قدر وسیع ہوتا جاتا ہے وہ اتنا ہی اپنے جوش و تعصب میں پختہ ہوتے جاتے ہیں۔ البتہ اس گروہ کی ایک اقلیت ایسی ہوتی ہے جن کا رجحان انصاف پسندی کی طرف ہوتا ہے یہ لوگ جب اپنے مخفی تعصب اور جمود کی عادت کو چھوڑتے ہیں تو ان سے صحیح نقطۂ نظر اور صائب غور و فکر کی امید ہوتی ہے۔

سیاسی[1] امور میں اجماع

شریعتِ اسلامی میں احکام کے تین درجے

شریعت اسلامی سابقہ شریعتوں سے کئی اعتبارات سے مختلف ہے۔ مثال کے طور پر اس کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ یہ آسان، فطری اور کامل شریعت ہے جبکہ اس سے پہلی شریعتیں بعض زمانوں کے ساتھ مخصوص اور عام فطرت انسانی کے خلاف تھیں اور تربیت کے کسی خاص پہلو کے پیش نظر اتاری گئی تھیں۔ اس کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ شریعت نہ بہت مفصل ہے اور نہ بالکل مجمل، بلکہ یہ مجمل و مفصل کے بین بین ہے۔ اس کی تیسری نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ دوسری شریعتوں کے علی الرغم اس میں احکام کے تین درجے ہیں۔ رخصت[1]، واجب[2] اور احسان[3]۔

احکام کے ان مدارج میں فرض کو درمیان میں رکھا گیا ہے اس لئے کہ خدا کے نیک بندوں کی اکثریت کی طبیعتیں اس سے مناسبت رکھتی ہیں۔ رخصت ان معاملات میں ہے جن میں اگر ان کی قوت کا دائرہ تنگ ہو جاتا ہے۔ احسان کا مرتبہ عمدہ اخلاق کے تقاضہ پر حاصل ہوتا ہے احکام کے ان تینوں مدارج کا بیان ذیل کی تین آیات میں دیکھئے[2]۔ فرمایا۔

۱۔ لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْا اِلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ۔ (الممتحنہ ۸)

خدا تمہیں اس بات سے منع نہیں کرتا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ بھلائی اور انصاف کا سلوک کرو جنہوں نے تمہارے ساتھ دین کے معاملہ میں جنگ نہیں کی اور نہ تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا۔ خدا انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

۲۔ هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ (الرحمٰن ۔ ٦)

احسان کا بدلہ احسان کے سوا کچھ نہیں ہے۔

۳۔ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ۝ وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ۝ (حم السجدہ ۳۴، ۳۵)

تم ایسے طریقہ سے جواب دو جو بہت اچھا ہو تب تم دیکھو گے کہ جس شخص کے اور تمہارے درمیان عداوت تھی وہ ایسا ہو جائے گا گویا تمہارا گرم جوش دوست۔ یہ بات وہی لوگ حاصل کر سکتے ہیں جو ثابت قدم ہیں اور اسے نہیں پا سکتے مگر بڑے صاحب نصیب لوگ۔

رخصت اور احسان میں بنیادی فرق یہ ہے کہ رخصت ہمیشہ کسی قبیح فعل میں ہوتی ہے جب کہ احسان کا تعلق اس عمل سے ہوتا ہے جس کو اختیار کرنا اولیٰ ہو۔ مثال کے طور پر آیت لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْ اَيْمَانِكُمْ۔ بقرہ ۲۲۵ (اللہ تمہاری لغو قسموں پر تمہارا مؤاخذہ نہیں کرے گا) میں ایک رخصت کا بیان ہے۔ آیت

---

[1] افسوس کہ اجماع کی تیسری قسم یعنی سیاسی امور میں اولو الامر کے اجماع کے بارے میں مولانا فراہی نے کوئی چیز سپرد قلم نہیں کی۔
[2] کا حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو۔

نوٹ:۔ حاشیہ پچھلے صفحہ کا۔

[2] مصنف علیہ الرحمۃ نے یہ تینوں آیات علی الترتیب رخصت، واجب اور احسان کا مفہوم واضح کرنے کے لئے پیش کی ہیں۔ ان میں پہلی آیت سورہ الممتحنہ کی ہے۔ اس سورہ میں مشرکین سے قطع تعلق کی مسلمانوں کو تعلیم دی گئی ہے۔ آیت زیر بحث کے ذریعہ قطع تعلق کے حکم عام میں اس قدر رخصت دی گئی کہ ان مشرکین سے حسن سلوک کیا جا سکتا ہے جن کا مسلمانوں کے خلاف نبرد آزمائی میں کوئی ہاتھ نہیں اور جنہوں نے ان کو ہجرت پر مجبور نہیں کیا۔
دوسری آیت میں یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ خدا کے قانون میں یہ بات واجب ہے کہ احسان کا بدلہ احسان کے ساتھ ادا کیا جائے۔
تیسری آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے متبعین کو تلقین کی گئی ہے کہ وہ مخالفین کی ریشہ دوانیوں اور کج بحثیوں کے علی الرغم احسان کا مقام حاصل کریں اور ان کے جواب میں اعلیٰ کردار کا مظاہرہ کریں۔ (خ ۔ م)

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ۔ (نحل ۱۰۶)

جو شخص ایمان لانے کے بعد خدا کے ساتھ کفر کرے سوائے اس شخص کے جو مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان پر ٹکا ہوا ہو، بلکہ وہ جس نے کفر کے لئے دل کھول دیا ہو، تو ایسے لوگوں پر اللہ کا غضب ہوگا۔

کے جملہ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ میں ایک رخصت بیان کی گئی ہے۔ بعض اشیاء کو حرام ٹھہرانے کے بعد آیت فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (مائدہ ـ ۳) (پھر جو شخص بھوک سے لاچار ہو اور گناہ کی طرف مائل نہ ہو تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے) کے الفاظ میں اضطرار کی حالت میں ان کو استعمال کرنے کی رخصت دی گئی ہے۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ رخصت ایسی چیز نہیں جس کا حکم دیا گیا ہو۔ اس کے برعکس احسان حکم کے تحت داخل ہے، مثلاً فرمایا

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى (نحل ـ ۹)

اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے عدل کا، احسان کا اور قرابتداروں کو دینے کا۔

البتہ احسان کا ترک فرض کے ترک کی نسبت ہلکی چیز ہے۔

یہ احکام کے تین مدارج کا بیان تھا۔ باقی رہی فرض، واجب، مستحب، مباح، مکروہ، حرام اور موبق میں ان کی تقسیم، تو وہ اپنی جگہ درست ہے۔

مراسلہ و مذاکرہ

امین احسن اصلاحی

بیعت کی شرعی حیثیت

"ایک بات عرصہ سے ذہن میں کھٹک رہی ہے وہ یہ کہ بعض لوگ مجھ پر برابر یہ زور ڈال رہے ہیں کہ اب مجھے کسی کے ہاتھ پر بیعت کر لینی چاہیے۔ اب تک تو میں اس بات کو ٹالتا رہا ہوں لیکن جب سے ملازمت کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوا ہوں مجھے بھی بار بار یہ خیال ہوتا ہے کہ ممکن ہے یہ چیز شریعت میں ضروری ہو اور میں اس سے محروم رہ جاؤں۔ میں نے آپ کی کتاب تزکیۂ نفس پڑھی ہے اس میں آپ نے اس چیز کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے جس سے گمان یہی ہوتا ہے کہ آپ اس کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ لیکن بعض لوگ تو اس کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک تو اس کی اہمیت اتنی ہے کہ گویا یہ نجات کے لئے ضروری ہے۔ براہ کرم بتائیے کہ اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ بعض لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص جماعت سے الگ رہے تو وہ دوزخی ہے۔"

جواب: بیعت درحقیقت سمع و طاعت کا ایک معاہدہ ہے جو اصلاً اللہ اور رسول کے لئے ہے۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے اللہ اور رسول کی اطاعت کے لئے بیعت لی اور مسلمانوں نے یہ بیعت کی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سمع و طاعت کی یہی بیعت خلفائے راشدین نے لی اور مسلمانوں نے ان کے ہاتھ پر بھی بیعت کی۔ نبی صلی اللہ

علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کی بیعت میں اگر کوئی فرق ہے تو صرف یہ ہے کہ خلفاء کی بیعت اطاعت فی المعروف کی شرط کے ساتھ مشروط تھی یعنی حدود شریعت کے اندر اطاعت کے لئے۔ اور اللہ و رسول کی اطاعت کی بیعت مطلق تھی اس لئے کہ اللہ و رسول کی اطاعت میں کسی بات کے خلاف شریعت ہونے کا سوال نہیں پیدا ہوتا ان کی طرف سے جو حکم و ہدایت بھی ہو وہی عین شریعت ہے اور اس کی اطاعت لازم ہے۔ دوسروں کی اطاعت صرف حدود شریعت ہی کے اندر جائز ہے، اس سے ہٹ کر جائز نہیں ہے۔

یہ بیعت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل اور اُمت کے اجماع سے ثابت ہے اور اس میں کسی اختلاف کے لئے گنجائش نہیں ہے۔ یہ بیعت اُمت کی شیرازہ بندی اور اس کے نظام سیاسی کے قیام و بقاء کے لئے ناگزیر ہے اس وجہ سے جہاں اسلامی نظام موجود ہو وہاں کسی مسلمان کے لئے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اس نظام کے قلادہ اطاعت سے الگ ہو۔ اگر وہ اس سے الگ ہوا تو یہ چیز خود ملت سے الگ ہو جانے کے مترادف ہوگی۔ احادیث میں الجماعۃ یا سواد اعظم کے نام سے جس جماعت کے ساتھ وابستہ رہنے کی نہایت شدت کے ساتھ تاکید کی گئی ہے اور جس سے جماعت کے کارپردازوں کی طرف سے کفر صریح کے اظہار و اعلان کے بغیر علیحدگی پر جہنم کی وعید سنائی گئی ہے وہ یہی جماعت ہے نہ کہ ہر وہ بھیڑ جس کو کچھ ہوشیار لوگ اپنے دنیوی اغراض کے لئے دین کے نام پر اکٹھی کر لیں اور پھر ہر اس شخص کو جہنم کی وعید سنانے لگیں جو ان سے الگ رہے یا ان سے علیحدگی اختیار کرے۔ اس قسم کی جماعتوں سے الگ رہنے پر کسی وعید عذاب کا تو کیا ذکر کسی صحیح شرعی حکومت کے اندر ان کے قیام کے جواز ہی کا کوئی امکان نہیں۔ کسی صحیح اسلامی حکومت کے اندر سمع و طاعت کی بیعت حکومت کے سربراہ کار کے سوا کوئی دوسرا لے ہی نہیں سکتا۔

اسلام میں جس بیعت کا ثبوت موجود ہے وہ یہی ہے اور یہ اسلام کے سیاسی نظام کے تقاضوں سے وجود میں آئی ہے اور اس میں اصل شے جو مطلوب ہے وہ بیعت کی کوئی رسمی شکل نہیں ہے بلکہ سمع و طاعت کا عہد ہے۔ اس کا اظہار و اعتراف اگر کسی اور شکل میں ہو جائے تو بیعت کا منشا اس سے بھی پورا ہو جائے گا لیکن بیعت کا طریقہ چونکہ مسنون طریقہ ہے اس وجہ سے اس میں جو خیر و برکت ہے وہ کسی دوسرے طریقہ میں نہیں ہو سکتی۔

ہمارے صوفیا اور مشایخ جو بیعت لیتے ہیں اس کا کوئی ثبوت صدر اوّل میں نہیں ملتا لیکن صدر اول میں اسی کا ثبوت نہ ملنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ چیز ناجائز ہے۔ جب تک مسلمانوں کا نظام سیاسی منہاج نبوت پر باقی رہا وہ دین و دنیا دونوں کی صلاح و فلاح کا ضامن رہا، وہ معاشی و سیاسی ضرورتوں کی فکر بھی کرتا تھا اور لوگوں کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ استوار رکھنے کے لئے بھی اہتمام کرتا تھا لیکن جب اس نظام میں بگاڑ پیدا ہو گیا، حکومت کی باگ خلفائے رسولؐ کے بجائے قیصر و کسریٰ کے مقلدوں کے ہاتھ میں آگئی، اور اللہ کے ساتھ لوگوں کا تعلق ٹوٹتا ہوا نظر آیا تو جن لوگوں کی نظر میں اس تعلق کی اہمیت تھی انہوں نے اس کو استوار رکھنے کے لئے لوگوں کو اپنے ساتھ وابستہ کرنے کی کوشش کی اور اس وابستگی کے لئے بیعت لینے کا طریقہ اختیار کیا۔

یہ بیعت اصلاً سمع و طاعت کی بیعت نہیں بلکہ صحبت و تعلق کی بیعت ہوتی تھی اور مقصود اس سے صرف یہ تھا کہ لوگ اس صحبت و تعلق کے رشتہ سے فی الجملہ شریعت سے وابستہ رہیں۔ اصلاح و تزکیہ نفس میں اس چیز کا جو درجہ ہے میں اس پر اپنی کتاب تزکیہ نفس میں بقدر ضرورت گفتگو کر چکا ہوں۔ میرے نزدیک یہ چیز نہایت ضروری ہے۔ ہر شخص جو اپنی اصلاح کا طالب ہو اس کے لئے لازم ہے کہ وہ صاحب علم اور صاحب تقویٰ لوگوں کی صحبت سے جس حد تک ممکن ہو فائدہ اُٹھائے۔ جو چیز اس سے حاصل ہو سکتی ہے وُہ مجرد کتابوں کے مطالعہ سے نہیں حاصل ہو سکتی۔ صاحب علم اور صاحب تقویٰ کی تلاش بہر حال ہر طالب کا اپنا کام ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ یہ مشکل کام ہے لیکن جو شخص اصلاح کا طالب ہوگا توقع یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی رہنمائی فرمائے گا۔

اگر آپ نے میری کتاب تزکیہ نفس پڑھ لی ہے تو تصوف کے مروجہ طریقوں اور اس کے معروف اسکولوں کے باب میں میری رائے آپ سے مخفی نہیں ہو سکتی۔ میں بلاخوف لومۃ لائم یہ رائے رکھتا ہوں کہ ان میں سے کوئی طریقہ بھی خطرات و خدشات سے محفوظ نہیں ہے۔ میں ان سلسلوں کے اکابر کے لئے اپنے دل میں بڑا احترام رکھتا ہوں لیکن میرے عقیدے میں تزکیہ نفس کے لئے سلامتی کا راستہ وہی ہے جس کی طرف کتاب و سنت میں رہنمائی کی گئی ہے۔ اس رہنمائی سے فائدہ اٹھانے کے لئے ضروری کتابوں کا مطالعہ بھی کیجئے اور جیسا کہ میں نے عرض کیا اصحاب علم و تقویٰ کی صحبت بھی اٹھائیے۔ اس مقصد کے لئے آپ جس طرح کسی صاحب علم کے شاگرد بن سکتے ہیں اسی طرح کسی صاحب

علم و تقویٰ کے مرید بھی۔ اگرچہ پیری مریدی میرے ذوق کی چیز نہیں ہے، بالخصوص موجودہ زمانے میں۔ لیکن پیر خدا ترس ہو تو اس میں کوئی خاص قباحت بھی نہیں۔ خدا ترسوں کی صحبت بڑی نعمت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو یہ نعمت نصیب کرے۔

(بقیہ مضمون "اسلامی نظام تعلیم کا ارتقاء" صفحہ ۵۲ سے آگے)

اصحاب نے ذاتی لائبریریاں قائم کیں جن میں منطق، فلسفہ، ہیئت اور دوسرے علوم پر بھی قیمتی کتابیں جمع کی گئی تھیں۔ موصل کے شہریوں نے دسویں صدی کے وسطِ اول میں ایک لائبریری قائم کی تھی جس کی طرف سے طلبہ کو کاغذ بھی مفت مہیا کیا جاتا۔ بواحمد سلطان اودل الدولہ (۹) (۹۴۶ء تا ۹۸۲ء) کی قائم کردہ لائبریری کی یہ شان تھی کہ کتابیں الماریوں میں سجی تھیں، ان کی فہرست موجود تھی اور باقاعدہ عملہ اس کے انتظام پر مامور تھا۔ اسی صدی میں بصرہ میں ایک ایسی لائبریری تھی جس کے مؤسس کی طرف سے اس میں کام کرنے والے علماء کے لئے وظائف بھی مقرر تھے۔ اور رے کی ایک لائبریری کے مسودے چار سو اونٹوں کا بوجھ تھے اور ان کی فہرست دس جلدوں پر مشتمل تھی۔ ان لائبریریوں کو علمی مباحثوں کے مرکز کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا تھا۔

کتابوں کی دوکانیں عباسی دور میں ہی کتابوں کی دوکانیں تجارتی اور تعلیمی ادارے کی حیثیت سے نمودار ہوئیں۔ یعقوبی نے ۸۹۱ء میں دعویٰ کیا کہ دار الخلافے کے ایک ہی بازار میں سو سے زیادہ کتاب فروشوں کی دوکانیں تھیں۔ یہ کتاب فروش بسا اوقات خوشنویس، نقل نویس اور پڑھے لکھے لوگ ہوتے اور اپنی دوکانوں کو گوداموں اور ذخیروں کے طور پر ہی استعمال نہ کرتے تھے بلکہ انہیں ادبی بحث و تمحیص کے مرکز کی حیثیت بھی دے رکھی تھی۔ الندیم (ف ۹۹۵ء) جو "وراق" (سٹیشنر) کے نام سے معروف تھا، لائبریرین یا کتاب فروش ہی تھا اور اسی کی ترتیب کردہ فہرست کتب مشہور کتاب "الفہرست" کا ماخذ بنی۔ اسی ماخذ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ عراق کے ایک عاشقِ کتب کے پاس ایک بڑے صندوق میں مصری پارچوں، چینی کاغذ اور چمڑے پر لکھے ہوئے مسودے موجود تھے جن پر پانچ چھ نسلوں کے فضلاء کے نام ثبت تھے۔

(Voice of Islam)

مقالات

جناب خالد مسعود صاحب

حفاظتِ قرآن

(۲)

امانت وحی کیلئے نبی کا انتخاب

نزولِ قرآن کے آسمانی انتظامات کا جائزہ لینے اور یہ دیکھنے کے بعد کہ حفاظت قرآن کے مقصد سے یہ انتظامات بہت کافی تھے، اب ہم یہ دیکھیں گے کہ انسانوں میں پہنچنے کے بعد وحی کی حفاظت و صیانت کا کیا اہتمام ہوا؟ اس سلسلہ میں کئی بحثیں پیدا ہوتی ہیں مثلاً امانت وحی کے لئے انسانوں کے جس فرد کا انتخاب ہوا اس کی اہلیت کیا کچھ تھی؟ القائے وحی کا کام کہاں تک محفوظ قرار دیا جا سکتا ہے؟ نبیؐ نے جو کچھ وحی کے نام سے پیش کیا آیا وہ واقعی کلام خداوندی ہی تھا؟ وغیرہ۔ اب ہم ان پہلوؤں پر غور کریں گے۔

نبیؐ کی صلاحیت منصب نبوت و رسالت کے باب میں یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ منصب کسبی نہیں بلکہ وہبی ہے یعنی یہ ممکن نہیں کہ کوئی شخص مجاہدہ و ریاضت وغیرہ کا شغل کر کے اپنے آپ کو نبوت کا مستحق بنا سکے بلکہ نبی کا انتخاب اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے ہوتا ہے۔ وہ جس شخص کو چاہتا ہے نبوت کا تاج پہنا دیتا ہے۔

یہ نقطۂ نظر حقیقت پر مبنی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ خدا کے ہاں کوئی ایسا معیار مقرر نہیں جس پر پرکھ کر وہ کسی فردِ انسانی کو نبوت کا رتبہ بلند عطا کرتا ہے۔ جس طرح خدا کے ہر کام میں حکمت ہے اور اس کا کارخانۂ کائنات ایک نظام کے تحت چلتا ہے اسی طرح انبیاء کی بعثت کے بھی اس کے

ہاں قواعد مقرر ہیں۔ انہی قواعد اور سنن کے مطابق نبوت کسی فرد کو عطا کی جاتی ہے۔ پورے سلسلۂ انبیاء پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جن شخصیات کو اس منصب پر سرفراز کیا گیا وہ اپنی سلیم الفطرتی، اپنی نیکی، خدا ترسی اور امانت و دیانت میں اپنے زمانہ کے لوگوں میں سب سے ممتاز تھے اور اپنی شرافت و نجابت اور اخلاقی و روحانی برتری کے اعتبار سے اپنی اپنی قوموں کے گل سرسبد تھے۔ ایک بچہ کسی حکمران کے گھر میں پیدا ہوا یا کسی باسی گوشت کھانے والی بیوہ کے ہاں، اس کی پرورش کسی معبد کے متولیوں کے ہاں ہوئی یا شرک کے گہواروں میں، بڑا ہونے پر اگر سلیم الفطرت، خدا ترس اور پیکرِ اخلاق ہوا تو خدا کی مشیت نے اسے نبوت کا مقامِ بلند مرحمت فرمایا۔ اس کے برعکس بدطینت اور دنیا دار لوگ خواہ وہ عابد و زاہد خواتین کا دودھ پی کر پلے ہوں، ان کی پرورش انبیاء و صلحاء کی گودوں میں ہوئی ہو اور دنیا والوں کی نظروں میں وہ کتنے ہی بلند رہے ہوں، اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ قدر تو کیا پاتے الٹا اس کی لعنت کے مستحق ہوئے۔ منصب نبوت پر فائز کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ خزف ریزوں میں سے بھی گوہر نکال لیتا رہا ہے۔

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ (انعام ۱۲۴) — اس کو خدا ہی خوب جانتا ہے کہ وہ اپنی پیغمبری کسے عنایت فرمائے۔

اللہ تعالیٰ کی اس سنت کی روشنی میں اب مہبطِ قرآن حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ پر نگاہ دوڑایئے۔

آپ جس قوم میں پیدا ہوتے ہیں وہ مشرکین کی قوم ہے جو ایک عرصہ دراز سے آسمانی ہدایت سے بے بہرہ ہے، یہ قوم باپ دادا کی اچھی یا بُری روایات کو مانتی ہے اور انہی پر قانع ہے، اس کے پاس حق و باطل یا خیر و شر کے لئے کسوٹی یہی روایات ہیں، نتیجۃً یہ قوم بیشمار اخلاقی کمزوریوں میں مبتلا ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا بچپن اسی قوم میں گزرتا ہے، آپ کی تربیت اسی قوم کے سرکردہ لوگ کرتے ہیں۔ باپ دادا کی روایات کا ورثہ آپ کو بھی ملتا ہے۔ آپ اس ماحول میں ان تمام حالات سے گزرتے ہیں جن میں سے ہر آدمی کو اپنی زندگی میں گزرنا پڑتا ہے۔ لیکن آپ کی صفات اپنے تمام اہل خاندان سے ممتاز ہیں، شرک کا تانا بانا آپ کے ذہن کے سانچے میں نہیں اترتا، بتوں کے سامنے کورنش بجا لانے کے تصور سے آپ کو وحشت ہوتی ہے، آپ کے اندر انسانی ہمدردی کا جذبہ بہت وافر ہے کہ غریبوں، محتاجوں، بیواؤں اور حاجتمندوں کی امداد کے لئے بے چین رہتے ہیں۔ قوم آپ کو "صادق" اور "امین"

کے القاب سے نوازتی ہے۔ امانت و دیانت، حلم و شرافت، خدا ترسی و سخاوت کا ذکر آتا ہے تو لوگوں کی زبانوں پر خود بخود آپ کا نام آنے لگتا ہے۔

اس مجسم اخلاق کو جس کا سرمایہ افتخار ہی صداقت و امانت ہے، نیکی جس پر اوپر سے مسلط نہیں کی گئی بلکہ اس کی فطرت کی گہرائیوں میں رچی ہوئی ہے، اللہ تعالیٰ اپنے کلام پاک کا امین بناتا ہے۔ اسی سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ نبوت کے منصب پر جس شخص کو فائز کیا گیا اور حفاظتِ قرآن کے لئے جس کا انتخاب ہوا، روئے زمین پر اس سے بہتر امانتوں کا محافظ کوئی نہیں تھا۔ بعض لوگ نفس وحی پر ہی اعتراض وارد کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک وحی کی کوئی حقیقت نہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقت بس ایک مصلح کی تھی۔ آپ کو اپنی قوم کی زبوں حالی سے پریشانی ہوئی تو اس کی سربلندی کو آپ نے اپنا مقصد زندگی بنا لیا۔ لہٰذا جس چیز کو انہوں نے کلام الٰہی کہہ کر پیش کیا اس کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ آپ نے اپنی ذہانت سے کچھ اصول پیدا کئے اور ان پر اپنی قوم کو چلانا چاہا۔

ہمارے خیال میں یہ نقطۂ نظر محض قلتِ تدبر کا نتیجہ ہے۔ اس نظریہ کو غلط ثابت کرنے کے لئے متعدد شواہد پیش کئے جا سکتے ہیں مگر ہم صرف چند نمایاں باتوں ہی کی طرف یہاں اشارہ کریں گے:

ایک انسان کے ذہن و فکر کی تعمیر چند سالوں میں نہیں بلکہ اس کی پوری زندگی میں ہوتی ہے۔ اس کی تعلیم و تربیت، بچپن اور جوانی کے رجحانات، اس کا عزم و حوصلہ اور اس کا انداز فکر، ساری چیزیں مل کر اس کی زندگی کا اصلی رُخ متعین کرتی ہیں۔ ایک چوٹی کا عالم بھی اپنی زندگی کی ابتدا اساتذہ کے آگے زانوے تلمذ تہہ کر کے کرتا ہے، وہ ان سے سوالات کرتا ہے، ان کی تعلیم کو ازبر کرتا ہے، ان کے فکر پر غور کرتا ہے، اپنا فکر پیش کرتا ہے تو اساتذہ سے اس میں اصلاح لیتا ہے۔ جوں جوں اس کا تجربہ اور مطالعہ پختہ ہوتا ہے وہ اپنے مزعومات و نظریات پر نظر ثانی کرتا جاتا ہے۔ اس طرح پوری زندگی کی جدوجہد کے بعد بھی وہ یہ دعویٰ کرنے کی جرأت نہیں کرتا کہ اس کا فکر مزید کسی نظر ثانی یا تبدیلی کا محتاج نہیں رہا۔

اب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت پر غور کرو۔ آپ کی زندگی کی ابتداء عرب کے ایک ایسے گھرانے میں ہوتی ہے جہاں آپ کو والد کی شفقت پہلے دن ہی سے نصیب نہیں ہوتی۔ آپ کا دورِ طفولیت صحرا نشینوں میں گذرتا ہے جہاں آپ کو وہ تمام سہولتیں میسر نہیں جو تعلیم کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔ جوانی میں قدم رکھتے ہی آپ کو روزی کی تلاش میں تجارت کا پیشہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ چالیس سال تک کی

زندگی میں آپ ایک ایسے شریف آدمی نظر آتے ہیں جو ماحول کی نجاستوں سے اپنا دامن بچائے رکھتا ہو اور معاشرے میں جس کی شرافت کے گن گائے جاتے ہوں۔ آپ کو غور و فکر سے مناسبت ضرور ہوتی ہے مگر آپ کی زبان سے کبھی ایمان، اسلام، کلام اللہ، تجدید دین وغیرہ الفاظ نہیں سُنے گئے۔ آپ معاشرے کی نجاستوں سے خود اگرچہ ہمیشہ بچتے رہتے ہیں لیکن آپنے ان کے خلاف کبھی مورچہ نہیں لگایا، آپ ایک کامیاب تاجر ضرور ہیں لیکن اصول معاشرت و معیشت یا نظام ہائے عبادت و سیاست سے آپ کو کوئی دلچسپی نہیں، آپ عرب کے مشہور قصوں سے ضرور متعارف ہیں لیکن قوموں کے عروج و زوال کے فلسفہ یا یہود کی تحریفات سے واقف ہونے کے لئے آپ کو کسی عالم ادیان کی صحبت نصیب نہیں ہوئی۔

چالیس برس تک ایک خاموش اور پرسکون زندگی گزارنے کے بعد آپ یکایک اپنے نبی ہونے کا اعلان کر دیتے ہیں، یہ اعلان آپکے اندر بیشمار تبدیلیاں کر دیتا ہے۔ اب آپ کا جینا ایک خاص مقصد کیلئے ہو جاتا ہے اور یہ مقصد ایسا ہے جس میں آپ کی کوئی ذاتی منفعت پوشیدہ نہیں ہے آپ جس بات کی طرف بلاتے ہیں، اس کی حیثیت آپ کی نگاہ میں حرف آخر کی ہے۔ جو حقیقت پہلے دن آپ کی زبان سے نکلتی ہے، اپنی زندگی کے آخری سانس تک پورے تیئیس ۲۳ سال تک اسی کو دہراتے چلے جاتے ہیں۔ اتنے طویل عرصہ میں کسی ذہنی ارتقا یا اپنے نقطۂ نظر میں ترمیم و تنسیخ کرنے کی کوئی مثال دیکھنے میں نہیں آتی۔ آپ جو کچھ کہتے ہیں اس پر لوگوں کا تعاون حاصل کرنے کی غرض سے ان کے غلط کاموں پر خاموش نہیں رہتے بلکہ ہر مخالفت سے بے پروا ہو کر، مشرکین ہوں یا یہود و نصاریٰ، بلا امتیاز سب پر بے باکانہ تنقید کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ نبوت کا اعلان کرتے ہی آپ ایک اعلیٰ درجہ کے معلم اخلاق بن جاتے ہیں، عبادات کا ایک پورا نظام کھڑا کر دیتے ہیں۔ معاشرت و معیشت اور فلسفہ و سیاست سب میں وُہ اصول فراہم کرتے ہیں جن پر ایک بہترین نظام زندگی قائم ہو سکے، تاریخ کا ذکر آتا ہے تو اس پر سیر حاصل تبصرہ کر دیتے ہیں، آپکے منہ سے وُہ وُہ باتیں نکلتی ہیں جن سے کل تک آپ خود ناواقف تھے، آپ جو کلام خدا کی طرف منسوب کرکے پیش کرتے ہیں اس کی دعوت بنیادی طور پر وہی ہوتی ہے جس کی طرف ہر زمانے کے انبیاء، صلحاء و ابرار بلاتے رہے ہیں۔ اس کی مقصدیت، مضمون آفرینی، اندازِ انذار و تبشیر

اور اسلوب کی جلالت و عظمت کی مثال کسی انسانی کلام میں نہیں ملتی۔ اگر اس کی کچھ جھلکیاں نظر آتی ہیں تو وہ توریت اور زبور کے بعض حصوں میں نظر آتی ہیں۔ پھر یہ کلام ایسا معجز ہے کہ بڑے بڑے فصیح اللسان لوگوں کی زبانیں اس کے آگے گنگ ہو جاتی ہیں۔ اور تو اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی زبان اس معجز کلام کی فصاحت و بلاغت کو نہیں پہنچ سکتی۔

انسانی نفسیات یہ ماننے سے قاصر ہے کہ اس طرح کا واقعہ کہیں پیش آسکتا ہے لیکن تاریخ شاہد ہے کہ یہ واقعہ پیش آیا اور اسی حیرت انگیز طریقہ سے پیش آیا۔ لہذا یہ مانے بغیر چارہ نہیں کہ چالیس سال کی عمر کو پہنچ کر آپکے دل میں وحی الٰہی کا وہی چشمہ اُبل پڑا جو کوہ طور پر موسیٰ کے دل میں اُبل پڑا تھا۔

خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نبوت پر لوگوں کے اعتراضات کے جواب میں اسی حقیقت کا اظہار فرمایا اور آپ کی قوم سے اس کا کوئی جواب نہ بن آیا۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَیْكُمْ وَلَاۤ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِیْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ

کہہ دو کہ اگر خدا چاہتا تو نہ میں ہی یہ کتاب تم کو سناتا اور نہ وہی تمہیں اس سے واقف کرتا۔ میں آخر اس سے پہلے بھی ایک عمر تم میں رہا ہوں، کیا تم سمجھتے نہیں ؟

یعنی اتنا عرصہ میں تمہارے درمیان رہا ہوں۔ اس عرصہ میں میرے افکار و خیالات اور عزائم تمہارے سامنے رہے ہیں۔ آخر کوئی بات تو ہے کہ ادھر چالیس سالوں میں تو میرے اندر نبوت و رسالت کی قسم کی چیزوں کا کوئی رجحان نہیں پایا گیا اور اب یک لخت میں اس طرح کی باتیں کرنے لگا ہوں۔

ایک اور موقع پر قرآن کریم میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ صفت بیان کی گئی ہے۔

وَمَا هُوَ عَلَى الْغَیْبِ بِضَنِیْنٍ (تکویر)

اور وہ غیب کا حریص نہیں ہے۔

اس کا مفہوم بھی یہی ہے کہ نبی اپنی سابقہ زندگی میں غیب کی باتیں بتانے کا رسیا کبھی نہیں رہا ہے کہ اب اس کی وحی پر اس کی پھبتی چست کی جائے۔ اس سے زیادہ واضح سورہ شوریٰ کی یہ آیت ہے۔

وَكَذٰلِكَ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا

اور اسی طرح ہم نے اپنے امر کی رُوح تمہاری طرف وحی کی۔ تم نہ تو کتاب کو جانتے تھے اور نہ ایمان کو لیکن ہم نے اس کو نور بنایا کہ اس سے ہم

نَهْدِىْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا (شوریٰ ۵۲)

اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں۔

آپ کے اس طرح کے اعلان اگر خلاف واقعہ ہوتے تو آپ کے مخاطبین ہر طرف سے آپ کی تردید کرنے لگ جاتے لیکن فی الواقع وہ خود اپنے اعتراضات کی کوئی بنیاد نہیں پاتے تھے اور حقیقت یہی تھی کہ ان کی معتمد علیہ شخصیت کو خدا نے اپنی وحی کی حفاظت کے مشن کے لئے خاص کر لیا تھا۔

وحی کا تجربہ اوپر واضح ہو چکا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں اپنی بعثت کا کوئی تصور پہلے سے موجود نہ تھا، اس لئے وحی کا ابتدائی تجربہ آپ کے لئے بالکل غیر متوقع تھا۔ اس موقع پر آپ جس صورت حال سے دوچار ہوئے وہ آپ کے لئے ناشنیدہ اور انوکھی تھی۔ ان حالات میں خوف یا پریشانی کا لاحق ہونا ایک قدرتی امر تھا۔ لیکن نبوت کے معاملہ کا تعلق چونکہ براہ راست اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہوتا ہے اس لئے نبی کے اندر وحی کی ذمہ داریاں اُٹھانے کی صلاحیت پیدا کی جاتی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملہ میں بھی ایسا ہی ہوا۔ آپ کے سامنے جب جبریلؑ پہلی مرتبہ آئے اور پڑھنے کے لئے کہا تو آپ نے جواب دیا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ اس پر جبریلؑ نے آپ کو سینے سے لگایا اور دوبارہ وہی بات دہرائی۔ جب تین مرتبہ ایسا ہوا تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھنا شروع کر دیا اور آپ کے اندر وہ صلاحیتیں اُبھر آئیں جن کا اظہار اس سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپؐ کو پہلے دن ہی سے وحی کے لئے موزون کر دیا گیا۔ اس کے بعد آپؐ کی حالت یہ ہو گئی کہ آپؐ وحی آنے کے مشتاق رہتے اگر اس میں کچھ دن کی تاخیر واقع ہو جاتی تو آپ کی نظریں آسمان کی طرف اُٹھنے لگتیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی موزونیت کا نتیجہ یہ تھا کہ وحی کے دوران آپؐ جو کچھ مشاہدہ فرماتے وہ حقیقت کے مطابق ہوتا، آپؐ کو جو کچھ سُنایا جاتا وہ ٹھیک ٹھیک آپ کے گوش گزار ہوتا، آپ کے قلب و ذہن بالکل حواس میں ہوتے، وحی کی تعلیم میں آپ کے لئے کوئی اشتباہ و ابہام نہ ہوتا اور آپ اپنی پوری قابلیت و صلاحیت کے ساتھ اسے حاصل کرتے۔ آپ کی یہ حالت سورہ نجم میں یوں بیان ہوئی ہے۔

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْىٌ يُّوْحٰى عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى

ذُوْ مِرَّةٍ فَاسْتَوٰى وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى فَاَوْحٰى اِلٰى عَبْدِهٖ مَا اَوْحٰى مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى

(نجم ۱۔۱۷)

تارے کی قسم جب ٹوٹے کہ تمہارے رفیق نہ رستہ بھولے ہیں نہ بھٹکے ہیں اور نہ خواہش نفس پر منہ سے بات نکالتے ہیں، یہ تو وحی ہے جو ان کی طرف بھیجی جاتی ہے۔ اس کو نہایت قوت والے طاقتور نے سکھایا وہ کھڑا ہوا جب وہ اوپر کے کنارے پر تھا پھر قریب آیا اور لٹک گیا تو دو کمان کے فاصلے پر یا اس سے بھی کم تھا، پھر خدا نے اپنے بندے کی طرف بھیجا سو بھیجا۔ جو کچھ اس نے دیکھا اس کے دل نے اس کو جھوٹ نہ جانا، کیا اس نے جو کچھ دیکھا تم اس میں اس سے جھگڑتے ہو۔ اور اس نے اسے دوسری بار بھی دیکھا سدرۃ المنتہیٰ کے پاس جس کے پاس رہنے کی جنت ہے جبکہ بیری پر چھا رہا تھا جو چھا رہا تھا نہ اس کی نگاہ بھٹکی اور نہ (حد سے) آگے بڑھی۔

وحی کے متعلق یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہئے کہ جبریل علیہ السلام کے ذمہ صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کا پہنچا دینا ہی نہ تھا بلکہ اسے یاد کرانا بھی ان کے فرائض میں سے تھا۔ لہٰذا وہ قرآن مجید کے نازل شدہ حصہ کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وقتاً فوقتاً مذاکرہ کیا کرتے تھے تاکہ قرآن کا کوئی حصہ آنحضرتؐ کی یادداشت میں غیر محفوظ نہ رہ جائے۔ یہ بات احادیث میں تفصیل سے آئی ہے۔ صحیح بخاری میں ہے:-

عن عائشۃ ام المؤمنین رضی اللہ عنہا ان الحارث بن ھشام سأل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال یا رسول اللہ کیف یأتیك الوحی فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احیانا یأتینی مثل صلصلۃ الجرس وھو اشدہ علی فیفصم عنی وقد وعیت عنہ ما قال واحیانا یتمثل لی الملك

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حارث بن ہشام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا "یا رسول اللہ! آپ پر وحی کیسے آتی ہے؟" تو آپ نے فرمایا "کبھی کبھی تو گھنٹی کی آواز کی طرح آتی ہے اور وحی کی قسم میرے لئے سب سے دشوار ہوتی ہے جب یہ حالت ختم ہوتی ہے تو مجھے اس کی وحی یاد ہو چکی ہوتی ہے۔ کبھی کبھی فرشتہ میرے پاس آدمی کی

رجلا فیکلمنی فاعی ما یقول

شکل میں آتا ہے اور وہ میرے ساتھ کلام کرتا ہے تو جو کچھ وہ کہتا ہے میں اس کو یاد کر لیتا ہوں۔

دوسری حدیث میں ہے۔

عن ابن عباس کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اجود الناس و کان اجود ما یکون فی رمضان حین بلغاہ جبریل علیہ السلام وکان یلقاہ فی کل لیلۃ من رمضان فیدارسہ القراٰن فلرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اجود بالخیر من الریح المرسلۃ

ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام لوگوں سے زیادہ سخی تھے۔ رمضان میں جب جبریلؑ حضورؐ کے پاس آتے تو آپ اور زیادہ سخاوت کرنے لگتے۔ جبریلؑ رمضان کی ہر رات میں آپ کے پاس آیا کرتے اور قرآن کا مذاکرہ کرتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھلائیوں کی طرف تیز ہوا سے بھی زیادہ راغب ہوتے تھے۔

وحی کی تعلیم کو ذہن میں محفوظ کرنے کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی خوب احساس تھا۔ آپ اس کو بڑی توجہ سے حاصل کرتے اور یہ فکر رکھتے کہ مبادا اس کے حصول میں کوئی کوتاہی ہو جائے۔ حضورؐ کی اسی مستعدی کے پیش نظر جبریلؑ آپ کے لئے یہ بشارت لائے کہ وحی کے معاملہ میں آپ کو زیادہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں، آپ پورے اطمینان سے اس کو سنئیے اور بعد میں دہرائیے، اللہ اسے آپ کے سینے میں محفوظ کر دے گا اور وہ خود اس کی حفاظت کا ذمہ لے گا۔ فرمایا

وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰۤى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِىْ عِلْمًا۔ (طٰہٰ ــ ۱۱۵)

اور قرآن کے معاملہ میں وحی تمام ہونے سے پہلے جلدی نہ کرو اور دعا کرو کہ اے پروردگار میرے علم میں افزونی فرما۔

سورہ قیامہ میں یہی مضمون زیادہ وضاحت سے بیان فرمایا،

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ (قیامہ ۱۸)

نہ چلا اس کے پڑھنے پر اپنی زبان کو کہ جلدی سیکھ لے۔ ہمارا ذمہ ہے اس کو جمع کرنا اور اس کو سنانا، پس جب ہم اس کو سنا دیں تو اس کی پیروی کر۔

اللہ تعالیٰ کا یہی وعدہ تھا جس کے مطابق جبریل علیہ السلام نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قرآن کا دور کیا کرتے تھے۔ اسی کا تقاضا یہ بھی تھا کہ قرآن کی صحیح ترتیب آنحضورؐ کو بتا دی جاتی اور جب قرآن مکمل ہو جاتا تو آپ کو ٹھیک اسی ترتیب کے مطابق سنا دیا جاتا جس ترتیب پر یہ لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔ روایات سے بھی اس حقیقت کی تصدیق ہوتی ہے۔ ان میں جبریلؑ کے متعلق آیا ہے کہ عام طور پر وہ رمضان میں قرآن کا ایک ہی دور کیا کرتے تھے لیکن آنحضورؐ کے سال وفات انہوں نے مکمل قرآن کے دو دور کئے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی آخری مکمل ترتیب امت کو بتائی جس پر قرآن مرتب ہوا۔

(باقی)

ہفت روزہ
المنبر
کی ہر سطر دعوت الی اللہ اور اظہار حق کے لئے وقف ہے
آپ المنبر کا مطالعہ فرمائیے
المنبر کا ہر شمارہ اسلام کی بے لاگ اور فرقہ واریت سے پاک دعوت دیتا ہے۔
اسلام کے خلاف سازشوں کی بے نقابی کرتا ہے اور دین میں تحریف و ترمیم کے فتنہ کی سرکوبی اور اسلامیان عالم کو اسلام کے کلمہ جامعہ پر متحد کرنے کی مساعی کا حامل ہوتا ہے۔
طرز بیان شگفتہ ــــ اور ــــ استدلال واضح ہے
سوز و حرارت سے بھرپور مقالات "المنبر" کی خصوصیات ہیں
شرح:۔ سالانہ چندہ ۵ روپے، ایک پرچہ ۱۳ نئے پیسے
پتہ:۔ ہفت روزہ "المنبر" پوسٹ بکس نمبر ۱۰۱۔ ۳۴۹ جناح کالونی لائلپور

اقتباسات و تراجم

ڈاکٹر امیر حسن صاحب صدیقی
ترجمہ محمود احمد

اِسلامی نظامِ تعلیم کا ارتقاء

خلافتِ راشدہ کے ابتدائی دور میں ہی جزیرہ نمائے عرب اور دوسرے مفتوحہ ممالک میں قرآنِ حکیم کی تعلیم کے لئے مدرسوں کا قیام عمل میں آگیا تھا۔ بعد میں ان کے نصابِ تدریس میں وسعت دے دی گئی اور صرف و نحو اور خوشنویسی کو بھی اس میں شامل کر لیا گیا۔ عباسی عہد میں یہ ابتدائی مدارس، جو عام طور پر نمایاں مساجد میں قائم کئے گئے تھے، مملکت کے دور دراز گوشوں تک پھیل گئے اور حصولِ علم کی جد و جہد ایسا عوامی رنگ اختیار کر گئی کہ بغیر کسی سرکاری دباؤ کے ایک طرح کا لازمی تعلیم کا نظام جڑ پکڑ گیا۔ ان مدرسوں میں بچے بچیاں پانچ چھ سال کی عمر میں داخل کرلئے جاتے اور ان میں پڑھانے والے اساتذہ کے مشاہرے کا بار معاشرہ برداشت کرتا۔

یہ ابتدائی مدارس مساجد کے اندر یا ان سے ملحقہ عمارتوں میں قائم کئے جاتے۔ نصاب کا محور قرآنِ مجید ہوتا جس کی حیثیت مطالعے کی اہم درسی کتاب کی تھی۔ نوشت و خواند کے ساتھ ساتھ عربی صرف و نحو، قصصِ انبیاء بالخصوص حیاتِ نبویؐ سے متعلق روایات، پاکیزہ شاعری اور ریاضی کے بنیادی اصول بھی پڑھائے جاتے۔ تدریس کے دوران میں حفظ و ممارست پر خاص طور پر زور دیا جاتا۔ طبقۂ امراء کے تعلیمی نظریات کا اندازہ ان ہدایات سے لگایا جاسکتا ہے جو ہارون الرشید نے اپنے بیٹے امین کے اتالیق کو ان الفاظ میں دیں:

"ایسی درشتی سے کام نہ لیجئے کہ بچے کے ذہنی قویٰ مفلوج ہو کر رہ جائیں اور نہ ایسی نرمی ہی برتیے کہ وہ سہل انگاری کا عادی بن کر رہ جائے اور اسی میں عافیت ڈھونڈنے لگے۔ جس حد تک ممکن ہو شفقت اور نرمی سے کام لے کر اس کی اصلاح کی سعی کیجئے لیکن اگر وہ اس سے اثر پذیر نہ ہو تو درشتی اور سختی کے استعمال سے بھی گریز نہ کیا جائے۔"

اساتذہ عام طور پر قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ وہ ایک پیشہ ورانہ تنظیم سے منسلک نظر آتے تھے جس میں شیخ کی عطا کردہ "اجازت" یا سند کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ زرنوجی نے ۱۲۰۳ء میں تعلیم و تعلم کے موضوع پر اپنی تالیف کا ایک باب پیشۂ تدریس کی قدر و منزلت کے بیان کے لئے وقف کیا ہے اور اس میں حضرت علیؓ سے منسوب ایک مقولے کا حوالہ دیا ہے کہ "جس نے مجھے ایک حرف بھی سکھایا، وہ میرا آقا ہے۔"

اعلیٰ تعلیم کے ادارے

اعلیٰ تعلیم کا پہلا نمایاں ادارہ جو مسلمانوں نے قائم کیا، بیت الحکمت تھا جس کی بنا ۸۳۰ء میں مامون نے اپنی مملکت کے دار الخلافہ میں رکھی۔ یہ ادارہ صرف ترجمہ و تالیف ہی کا مرکز نہ تھا بلکہ عام اکیڈیمی اور پبلک لائبریری کا کام بھی دیتا تھا اور ایک رصدگاہ بھی اس سے ملحق تھی۔ یاد رہے کہ اس دور کی رصدگاہیں جو جگہ جگہ قائم کی گئی تھیں، علم ہیئت کی تدریس کا مرکز بھی تھیں اور اسی طرح وہ شفاخانے جو اس زمانے میں قائم ہونا شروع ہو گئے تھے، علمِ طب کی تعلیم و تدریس کا اہم ذریعہ بھی تھے تاہم صحیح معنوں میں پہلی مکمل اکیڈمی ہونے کا شرف مدرسہ نظامیہ کو حاصل ہوا جو طلبہ کی مادی اور روحانی ہر طرح کی ضروریات کا کفیل تھا۔ اسے ۱۰۶۶ء ۱۰۶۷ء میں سلجوقی سلاطین الپ ارسلان اور ملک شاہ کے فاضل وزیر نظام الملک نے قائم کیا اور یہ بعد میں قائم ہونے والے مدرسوں کے لئے نمونہ بنا۔ بواحدین اور دوسرے عجمی سلاطین کی طرح جنہوں نے خلفائے بغداد سے اقتدار چھین لیا تھا، سلجوقی امراء بھی علوم و فنون کی سرپرستی میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔

مدرسہ نظامیہ میں شافعی فقہ اور اشاعرہ کے کلامی مذہب کی تعلیم کا خاص طور پر اہتمام کیا گیا تھا۔ علمِ ادب کے مطالعے میں قرآن مجید اور جاہلی شاعری کو وہی بنیادی درجہ دیا گیا تھا جو بعد میں یورپی یونیورسٹیوں میں کلاسیکی ادب کو حاصل ہوا۔ طلبہ کی اقامت کا انتظام بھی کیا گیا تھا اور ان میں سے بیشتر اہلِ ثروت سے وظائف پاتے تھے۔ یہ امر دلچسپی کا باعث ہوگا کہ یورپی یونیورسٹیوں نے اس ادارے کی تنظیمی ہیئت کی بعض تفصیلات جوں کی توں اپنا لیں۔ ۱۱۸۷ء میں ایک عدالتی

کا ندے کی طرف سے ایک لاوارث طالب علم کی وفات پر اس کے کمرے کو مہر بند کرنے کی کوشش پر جو ہنگامہ بپا ہوا وہ اس حقیقت کا مظہر ہے کہ طلبہ میں اخوت اور بھائی چارے کی روح پیدا ہو گئی تھی۔

مدرسہ نظامیہ ایک مذہبی ادارہ تھا جسے حکومتِ وقت کی سرپرستی حاصل تھی۔ ابن اثیر نے ایک شیخ کا واقعہ نقل کیا ہے جسے پروانۂ تقرری ملنے پر بھی اپنے فرائض منصبی ادا کرنے کی اجازت اس وقت تک نہ ملی جب تک کہ خلیفۂ وقت نے اس کے تقرر کی توثیق نہ کر دی۔ عام طور پر ایک وقت میں ایک ہی شیخ کا تقرر ہوتا اور اس کے ساتھ دو یا دو سے زیادہ نائب کام کرتے جو ادنیٰ اور متوسط ذہن کے مالک طلبہ کی خاطر درس کے خاتمے پر اسے دہراتے اور اس کی تشریح و توضیح کرتے۔ ابن جبیر نے ایک مرتبہ ایک شیخ کا درس سُنا جو عصر سے مغرب تک جاری رہا۔ شیخ ایک چبوترے پر کھڑے لیکچر دیتے تھے اور طلبہ چوکیوں پر بیٹھے زبانی اور تحریری سوالات کی بوچھاڑ کر رہے تھے۔

اس مدرسے کو یہ شرف بھی حاصل ہوا کہ امام غزالیؒ نے مسلسل چار برس تک (۱۰۹۱-۹۵ء) اس میں درس دیا۔ انہوں نے "احیائے علوم" کے افتتاحی باب میں علم پر بحث کرتے ہوئے اس نقطۂ نظر کا ابطال کیا ہے کہ تعلیم و تدریس سے مقصود محض اشاعتِ علم ہوتا ہے اور اس بات پر زور دیا ہے کہ طلبہ میں اخلاقی حس پیدا کرنے اور بیدار رکھنے کی کوشش کی جانی چاہیئے۔ چنانچہ وہ پہلے مسلمان مصنف ہیں جنہوں نے تعلیم کو ایک منظم اخلاقی نظام کے لازمی جزو کے طور پر پیش کیا۔ مدرسہ نظامیہ کو بالآخر ۱۳۹۳ء میں ایک کم عمر ادارے المستنصریہ میں مدغم کر دیا گیا جسے آخری عباسی خلیفہ کے پیشرو مستنصر باللہ نے ۱۲۳۴ء میں ائمہ اربعہ کی فقہ کی اشاعت کے لئے قائم کیا تھا۔ اس کی عمارت کے دروازے پر گھڑیال نصب تھا اور اس میں شفاخانہ، لائبریری، حمام اور کھانے کے کمرے بھی موجود تھے۔

علمی اور ذہنی مشاغل کے ارتقاء کے نتیجے کے طور پر بصرہ، کوفہ، دمشق، بغداد، نیشاپور، حران اور مرو جیسے دوسرے اہم شہروں میں بھی یونیورسٹیاں قائم ہو گئیں۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ گیارہویں صدی عیسوی تک یونیورسٹیاں مساجد میں چلائی جاتی تھیں جس سے ایک طرف تو اساتذہ

کو اپنا ما فی الضمیر کہنے کی پوری آزادی حاصل رہتی اور دوسری طرف یونیورسٹی کے دروازے ہر مسلمان پر کھلے رہتے۔ تعلیم کی یہ عوامی حیثیت اور کسی ادارے کی سند کی جگہ استاد کے تبحر علمی اور ذاتی قابلیت پر اعتماد، تعلیم کے معیاری ہونے کی ضمانت کے لئے کافی تھے۔

ان یونیورسٹیوں کے طریقۂ تعلیم کے متعلق جو روایات ہم تک پہنچی ہیں ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں سیمینار کا طریقہ رائج تھا جو کہ آج کل مغربی یونیورسٹیوں میں بھی مقبولیت حاصل کر رہا ہے۔ جوزف ہیل کی کتاب "تمدنِ عرب" کے درج ذیل اقتباس سے اس امر کی مزید وضاحت ہوتی ہے۔ وہ لکھتا ہے:-

"ان درسوں میں شرکت کے لئے متجسس عوام ہی نہیں بلکہ چار دانگ سلطنت سے فضلاء بھی کھنچے چلے آتے تھے۔ حاضرین میں سے ہر شخص کو اجازت تھی کہ شیخ سے کوئی سوال کر ڈالے اور اگر استاذ سائل کی تشفی یا نکتے کی توضیح سے قاصر رہ جاتا تو اسی دم اپنی وقعت اور حیثیت کھو بیٹھتا۔ اگرچہ ہر استاذ کے درس کے ایام اور اوقات متعین ہوا کرتے تھے لیکن درس کا عرصہ مقرر نہ تھا اور کسی موضوع پر لیکچروں کی تعداد کا تعین استاذ کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ عام طور پر درس استاذ کی اپنی یا کسی دوسرے مصنف کی تصنیف پر مبنی ہوتا۔ شیخ ٹھہر ٹھہر کر بات کرتا اور حاضرین اسے آسانی سے قلمبند کر لیتے۔"

"یہ معلوم کرنے کے لئے کہ حاضرین بات سمجھ رہے ہیں کہ نہیں، استاذ وقتاً فوقتاً سوال کرتا رہتا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ لیکچر کا سلسلہ منقطع کر کے حاضرین سے بحث و تمحیص میں مشغول ہو جاتا"

"سائنس کی تدریس میں جو چیز مسلم اساتذہ کو دوسروں سے ممتاز کرتی تھی وہ مشاہدے پر زور دینا تھا جو کہ صحیح سائنٹیفک نقطۂ نظر ہے۔ سیڈیلو کے قول کے مطابق بغداد کے مکتب فکر نے ابتداء ہی سے سائنٹیفک نقطۂ نظر کا اہتمام کیا تھا اور ان کے بنیادی اصول یہ تھے

(۱) معلوم سے غیر معلوم کی طرف بڑھنا۔

(۲) کائناتی حوادث کا باریک بینی سے مشاہدہ

(۳) جب تک تجربے یا مسلم اصولوں کی شہادت موجود نہ ہو کسی چیز کی صحت کا یقین نہ کرنا۔

گیارہویں صدی عیسوی تک جب کہ ابھی سلاطین نے یونیورسٹیوں کی بنا نہ ڈالی تھی، معاش کے

معاملے میں اساتذہ کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونا پڑتا تھا اور وہ قضا کے مناصب یا پھر کسی ہنر یا پیشے کے ذریعے سے روزی کا انتظام کرتے ۔ سلاطین کی تاسیس کردہ باقاعدہ اکاڈمیوں میں اساتذہ مشاہرے پاتے ۔ یہ بھی یاد رہے کہ اس زمانے میں کاپی رائٹ کا اہتمام تھا جس سے بسا اوقات اساتذہ کو دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا کیونکہ کسی دوسرے کی تصنیف سے اس کی تحریری اجازت کے بغیر کسی عوامی درس میں استفادہ نہ کیا جا سکتا تھا ۔ مصنف کی موت کے بعد یہ حقوق اس کے ورثا کو منتقل ہو جاتے لیکن علم کی ترقی میں رکاوٹ بننے کی بجائے یہ نظام براہِ راست تفکر کا محرک اور تازگیِ علم کا ضامن بنا ۔

اعلیٰ دینی تعلیم کے ان اداروں کے نصاب کی بنیاد علمِ حدیث پر رکھی گئی تھی چنانچہ حفظ و مہارت پر خاص طور پر زور دیا جاتا ۔ قوتِ حافظہ نے اس حد تک ترقی پائی کہ امام غزالیؒ تین لاکھ احادیث حفظ کرنے میں کامیاب ہو گئے اور کہا جاتا ہے کہ امام احمد بن حنبلؒ کو دس لاکھ احادیث یاد تھیں ۔ ایک مرتبہ امام بخاریؒ کا امتحان یوں لیا گیا کہ ان کے سامنے ایک سو احادیث اس حالت میں پیش کی گئیں کہ ان کی اسناد اور متن کو گڈمڈ کر دیا گیا تھا ۔

تعلیمِ بالغاں کی ترویج کے لئے کوئی منظم کوشش نہ ہوئی تاہم مسجدیں ہر جگہ اہم تعلیمی مرکز کا کام دیتی رہیں ۔ کسی شہر میں داخل ہونے والا کوئی نو وارد کسی بھی مسجد میں اس اطمینان کے ساتھ داخل ہو سکتا تھا کہ وہ حدیث کے درس سے بھی مستفید ہو سکے گا ۔ ان اجتماعات میں خالص دینی مسائل کے ساتھ ساتھ لسانی اور ادبی موضوعات سے بھی تعرض کیا جاتا تھا ۔ عام مسلمانوں کو بلا روک ٹوک ان درسوں میں شرکت کی اجازت تھی ۔ اس طرح گیارہویں صدی تک مسجدیں اسلام کی اشاعت کا ذریعہ بنی رہیں ۔

مساجد کے حلقہ ہائے درس کے متوازی ادبی حلقے یا "مجالس الادب" بھی قائم تھیں جن کے اجلاس بالعموم امرا اور شائستہ اصحاب کے ہاں منعقد ہوتے ۔ یہ مجالس آرائیاں بنو عباس کے دور ہی میں شروع ہو گئیں ۔ ابتدا میں کئی خلفا کی زیرِ صدارت بھی شعر و شاعری کے مقابلے ، مذہبی مباحثے اور ادبی اجتماعات منعقد ہوئے ۔

لائبریریاں | کتابیں مساجد کی طرف بھی کھنچنے لگیں ۔ تحائف اور نذر کے ذریعے مساجد کی لائبریریوں میں دینی لٹریچر کے قیمتی نمونے جمع ہوتے چلے گئے ۔ علاوہ ازیں ذی وجاہت اور ذی ثروت (باقی برصفحہ)

تقریظ و تنقید

اِسلامی نظریۂ حیات

تالیف : خورشید احمد
صفحات : ۴۷۷
قیمت : ۶ روپے ۵۰ پیسے
ناشر : شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ کراچی یونیورسٹی

اُردُو میں اسلامی نظریے کی تشریح و توضیح پر اب تک اتنا کام کیا جا چکا ہے کہ اس پہلو سے اس زبان کی کم مائیگی کا شکوہ نہیں کیا جا سکتا ۔ ہمارے اصحابِ فکر نے پچھلی ربع صدی میں ایسا لٹریچر تیار کر دیا ہے جس میں جدید ذہن کے لئے طمانیتِ قلب کا سامان موجود ہے ۔ اگرچہ اب تک یہ دعویٰ تو نہیں کیا جا سکتا کہ احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کا حق ادا کر دیا گیا ہے لیکن جہاں تک عقائد کی عمارت کے ٹھوس اور عقلی بنیادوں پر اٹھانے اور دورِ جدید کے مسائل سے اسلامی نظام کے حسن و خوبی سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت کے اُجاگر کرنے کا تعلق ہے ، ہمارے علماء اور مفکرین کی کوششیں بڑی حد تک کامیاب رہی ہیں ۔ البتہ یہ لٹریچر اس قدر وسیع اور متنوع ہے کہ محققین اور علم کے شیدائیوں کے سوا کسی میں اس پر عبور کی ہمت پیدا ہو سکتی ہے اور نہ اس کے لئے فرصت ہی میسر آ سکتی ہے ۔ ادھر ایک عرصے سے اس چیز کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ عام قارئین اور طلبہ کے لئے اس لٹریچر سے تعارف کی سبیل پیدا کی جائے ۔ اس مقصد کے لئے موزوں طریق کار یہ ہو سکتا تھا کہ ایک طرف کوئی صاحبِ قلم ایک متوسط حجم کی تعارفی کتاب لکھنے کا بیڑا اٹھاتے جو اسلامی نظریے پر کی گئی کاوشوں کا نچوڑ شگفتہ اور دلنشین انداز میں پیش کر سکتی اور دوسری طرف اس کتاب کی توام بہن (COMPANION VOLUME .) کی تالیف کا انتظام کیا جاتا جس کے ذریعے سے نمایاں اصحابِ علم

کے مضامین کے اہم اقتباسات کی مدد سے ایک عام قاری کو اسلامی لٹریچر کے وسیع تر مطالعے پر آمادہ کیا جاسکتا۔ مغربی افکار کی مقبولیت کا ایک اہم سبب اس طرز کی کتابوں کی وسیع اشاعت ہے۔

"اسلامی نظریۂ حیات" ان دونوں کتابوں کا خلا بھرنے کے لئے لکھی گئی ہے اور اپنی طرز کی یہ کتاب بجا طور پر ایک کامیاب کوشش اور ایک اچھا بدل قرار دی جاسکتی ہے اور جس عجلت میں اس کی تالیف عمل میں آئی ہے اس میں شاید اس سے بہتر کاوش ممکن بھی نہ تھی۔ خدا بھلا کرے جناب اشتیاق حسین قریشی، شیخ الجامعہ کراچی، اور ان کے درد مند ساتھیوں کا جنہوں نے مسلم طلبہ میں اسلام کی حقانیت کا اذعان اور اسے دُنیا میں غالب کرنے کی تڑپ پیدا کرنے کی ضرورت کا احساس کیا اور اس طرح کراچی یونیورسٹی کے انڈر گریجویٹ طلبہ کے لئے اس کتاب کی تالیف کا سامان پیدا ہوا۔ جناب خورشید احمد اور ان کے معاونین نے جس محنت کے ساتھ اخذ و تلخیص اور اضافہ و ترتیب کے ذریعے اس میں نظم و یکجہتی پیدا کی ہے اور اسے اپنے موضوع پر حاوی بنا دیا ہے، اس کی داد نہ دینا ناانصافی ہوگی۔ قابلِ ستائش ہیں وہ علمائے کرام اور مصنفین جنہوں نے اپنی نگارشات نہ صرف یہ کہ بلا معاوضہ کراچی یونیورسٹی کے حوالے کردیں بلکہ مؤلف کو "قطع و برید" کا حق دے کر ایثار و قربانی کا عدیم المثال مظاہرہ کیا۔

یہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے۔ حصۂ اول میں "مذہب اور دورِ جدید" کے عنوان کے تحت چار ابواب میں ان مسائل کا جائزہ لیا گیا ہے جو عصرِ حاضر کی فکری تحریکوں اور مذہب میں تصادم سے پیدا ہوئے ہیں اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اسلام کس خوبی سے دورِ جدید کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہوسکتا ہے۔ بحث و استدلال کا رنگ نہ معذرت خواہانہ ہے اور نہ مناظرانہ۔ کہیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ اسلام کے مؤقف کی حقانیت ثابت کرنے کے لئے تکلف سے کام لیا گیا ہو۔ اس حصے میں "مذاہبِ عالم کا تقابلی مطالعہ" اور "مذہب کی ضرورت" کا ایک حصہ معاونین مؤلف کے قلم سے ہے اور بقیہ دو ابواب "زندگی کے بنیادی مسائل اور ان کا حل" اور "دورِ حاضر کی تحریکیں اور مذہب" مولانا ابوالحسن علی ندوی اور ڈاکٹر عبدالحمید صدیقی کی مطبوعہ کتب کے اقتباسات سے مرتب کئے گئے ہیں۔

دوسرے حصے میں "اسلامی فلسفۂ حیات" سے بحث کی گئی ہے۔ یہ حصہ آٹھ ابواب پر

مشتمل ہے اور قیمت و کمیت کے لحاظ سے بقیہ حصوں پر بھاری ہے۔ اس میں اسلامی نظریۂ حیات کی بنیادی خصوصیات اجاگر کی گئی ہیں، عقائد کی ٹھوس عقلی بنیادوں اور زندگی کے مسائل سے ان کے گہرے تعلق کو آشکارا کیا گیا ہے اور آخر میں اسلامی عبادات کی حکمت اور ان سے فرد اور معاشرے کی زندگی پر مترتب ہونے والے گہرے اثرات سے تعرض کیا گیا ہے۔ اس حصے میں "اسلامی نظریۂ حیات کی بنیادی خصوصیات" کا باب مؤلف کے قلم سے ہے اور بقیہ ابواب کا گلدستہ مولانا مودودی، سید سلیمان ندوی، مولانا امین احسن اصلاحی اور دوسرے اہلِ قلم کی نگارشات کے منتخب حصوں سے سجایا گیا ہے۔

آخری حصے پر "اسلامی نظریۂ حیات" کا عنوان دیا گیا ہے۔ اس میں شریعتِ اسلامی کے ماخذ اور اسلام کے سیاسی، اخلاقی، اور معاشرتی نظام سے تعرض کیا گیا ہے۔ اسی ذیل میں حجیتِ حدیث، شریعتِ اسلامی، پردہ، نظریۂ قومیت اور آج کے دوسرے نزاعی امور پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے۔ "اسلام کے سیاسی نظام" پر ایک باب مؤلف نے خاص طور پر اس کتاب کے لئے لکھا ہے۔ آخری باب مولانا صدر الدین اصلاحی کی تحریروں سے مرتب کیا گیا ہے اور اس کے ذریعے قاری میں ان تقاضوں کا شعور بیدار کرنے کی سعی کی گئی ہے جو اسلام اپنے ہر ماننے والے کے سامنے رکھتا ہے۔

مقدمے میں مؤلف نے اشتراکیت اور مغربی جمہوریت کی باہمی آویزش کے پس منظر میں اسلامی نظریۂ حیات کے حسن اور جامعیت کی ایک جھلک دکھائی ہے نیز تینوں حصوں کا تعارف اور ہر باب کی تمہید اور خاتمہ بالعموم مؤلف کے قلم سے ہیں۔ ابواب کی مختلف فصلوں کو مربوط رکھنے کے لئے کہیں کہیں چند ایک پیرے بڑھا دیئے گئے ہیں۔ جن کی وجہ سے قاری کے ذہن کو اچانک جھٹکوں سے کہیں سابقہ پیش نہیں آتا۔ البتہ یہ کتاب اسٹائل کی گوناگونی میں اپنی نظیر آپ ہے۔ مشکل ہی سے دو مسلسل فصلیں ایک ہی مصنف کے قلم سے لی گئی ہیں۔ اسٹائل کے اس مدوجزر اور کہیں کہیں طولانی تحریروں سے کتاب قدرے ثقیل ہوگئی ہے۔ ہماری رائے میں یہ مناسب رہے گا کہ آئندہ ایڈیشن دو جلدوں میں پیش کیا جائے۔ تعارفی کتاب کسی معروف صاحبِ قلم سے لکھوائی جائے یا کم از کم اس کا اہتمام کیا جائے کہ اس کا ہر باب ایک ہی صاحبِ فکر کی کاوش کا نتیجہ ہو اور دوسری

جلد معروف اصحاب فکر کی تحریروں کے اقتباسات پر مشتمل ہو۔

ہمیں یقین ہے کہ یہ کتاب وقت کی ایک اہم ضرورت پوری کر سکے گی۔ طلبہ کے لئے تو یہ کتاب مرتب ہی کی گئی ہے لیکن عام قاری بھی، انشاءاللہ اسے مفید پائیں گے اور کیا عجب کہ کئی سعید روحیں اس کتاب کے وسیلے سے اسلامی افکار کے وسیع تر مطالعے کے لئے اپنے اندر اکساہٹ محسوس کریں۔

کتاب ٹائپ کی دلنواز طباعت کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ قرآن کریم کی آیات بھی ٹائپ میں چھپوائی گئی ہیں جس سے ایک طرف تو اعراب کا اہتمام نہیں کیا جا سکا اور دوسری طرف بے شمار اغلاط بھی رہ گئی ہیں۔ ایک بات اور کھٹکی۔ کتاب میں (COMMUNISM .) کو کہیں اشتراکیت (ص ۲۱۲) سے اور کہیں اشتمالیت سے تعبیر کیا گیا ہے بہتر ہوتا اگر ایک ہی تعبیر کا التزام کیا جاتا۔

(م۔ا)

عبقریت محمدؐ

- ترجمہ : فروغ احمد۔
- صفحات : ۱۲۸
- قیمت : ۲ روپے۔
- شائع کردہ : ملک سراج الدین اینڈ سنز پبلشرز کشمیری بازار۔ لاہور (۸)

کرنافلی کاغذ پر بلاکوں سے شائع ہونے والی یہ کتاب عباس محمود العقاد کی کتاب "عبقریت محمدؐ" کا ترجمہ ہے۔ اس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو زندگی کے ہر میدان میں عمل پیرا دکھانے کی کوشش کی گئی ہے اور آپ کے سیاسی، انتظامی، مربیانہ اور عابدانہ اعمال و اشغال کو پیش کر کے آپ کی شخصیت کی عظمت کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگرچہ اختصار کے سبب سے اس کتاب میں بہت سے پہلو غیر واضح رہ گئے ہیں اور بعض جگہ مفہوم بالکل مبہم ہو کر رہ گیا ہے تاہم اس کتاب میں آنحضرتؐ کی عبقریت و عظمت کے موضوع پر روشنی ڈالنے کی اچھی کوشش کی گئی ہے۔

(ع۔د)

محی الدین پرنٹر پبلشر نے نقوش پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر میثاق "رحمانپورہ اچھرہ لاہور" سے شائع کیا۔